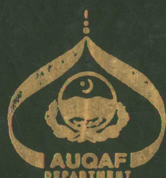
فقہی اختلافات کی اصلیت

اردو ترجمہ

الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف

تالیف

شاہ ولی اللہ دہلویؒ



محکمہ اوقاف حکومت پنجاب

فقہی اختلافات کی اصلیت

اردو ترجمہ

الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف

تالیف

شاہ ولی اللہ دہلویؒ



شائع کردہ

علماء اکیڈمی

شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور

۱۴۲۳ھ - ۲۰۰۲ء

طابع	ڈاکٹر طاہر رضا بخاری ڈائریکٹر مذہبی امور ر پرنسپل پنجاب اوقاف علماء اکیڈمی محکمہ اوقاف پنجاب
زیرنگرانی	میاں سلیم اللہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر تحقیق ومطبوعات پنجاب اوقاف علماء اکیڈمی لاہور
طبع سوئم	ربیع الاول 1423ھ۔ مئی 2002ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	
مطبع	
کمپوزنگ	الشیخ کمپوزنگ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

اسلامی ہند کے مایہ ناز، شہرہ آفاق، جلیل القدر، عالم ومفکر، مصلح ومؤلف، مسلمانان ہند کے مذہبی، علمی، فکری رہنما حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ 4۔ شوال 1114 ھ کو دہلی کے قریب ایک بستی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شاہ عبدالرحیمؒ جو صوفی بزرگ، ممتاز عالم اور نامور فقیہ تھے اور انہوں نے "فتاوی عالمگیری" کی تدوین وترتیب میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے دہلی میں ایک دینی مدرسہ بھی قائم کیا تھا جوان کے نام سے "مدرسہ رحیمیہ" کہلاتا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تعلیم اسی مدرسے میں حاصل کی اور پھر یہیں درس دینے لگے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کی مسند بھی آپ ہی نے سنبھال لی۔ 1143 ھ میں سفر حج اختیار کیا اور 1145 ھ میں وطن واپسی ہوئی۔ اسی دوران حرمین شریفین کے مشائخ واساتذہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ شاہ صاحب کا سفر حجاز تاریخ ساز ثابت ہوا۔ اس کے بعد ہی شاہ صاحب کے ذریعہ وہ کارہائے نمایاں اور تجدیدی واصلاحی خدمات انجام پائیں کہ جس سے اسلامی ہند کا نقشہ ہی تبدیل ہو گیا اور آج تک جتنے بھی دینی، علمی اور اصلاحی ودعوتی کام و تحریکیں ظاہر ہوئیں سب کا سلسلہ نسب شاہ ولی اللہؒ کے انہیں کارناموں سے جاملتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اصلاح اور تعلیم وتربیت کا کام بڑی لگن، اخلاص، محنت اور کاوش سے کیا اور بے شمار شاگرد تیار کر دیئے۔ اس کے پہلو بہ پہلو بڑی اہم اور معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے بعض کتابیں بے مثال ہیں اور اسلامی کتب

خانہ میں گراں قدر اور قیمتی اضافہ ہے۔ بطور مثال حجة الله البالغه، ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء اور تفہیمات الٰہیہ، الفوز الکبیر۔

شریعت کے مقاصد، اسرار و حکم اور فقہ و حدیث کے مابین تطبیق و اختلافی مسائل اور اختلافی نقطہ ہائے نظر کے درمیان تطابق دینے میں شاہ صاحبؒ نے مجتہدانہ انداز اختیار کیا، اور زندگی کے ہر میدان میں تجدیدی کارنامے انجام دیئے، خواہ اس کا تعلق عقائد، عبادات، معاملات سے ہو، اجتماع و اخلاق، تصوف و سلوک سے ہو، علم و تربیت سے ہو، سیاست و حکمرانی سے ہو، فرق و ملل و نحل سے ہو، انفرادی، سماجی یا گھریلو معاملات سے ہو، ہر ایک کا حل اور تشفی بخش جواب پیش کیا۔ آپ کی وفات 29۔محرم 1176ھ کو دہلی میں ہوئی۔

شاہ صاحبؒ کی چھوٹی بڑی، عربی، فارسی، قلمی و مطبوعہ تصنیفات کی تعداد صاحب تاریخ دعوت و عزیمت سید ابوالحسن علی ندویؒ کے شمار کے مطابق 53 تک پہنچتی ہے۔ آپ کی ہر تصنیف محققانہ اور مجددانہ ہے۔ آپ کی تصنیفات کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں میں افراط و تفریط کی اصل حقیقت واضح کرنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کرنے کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی بنیادوں سے پردہ ہٹایا۔ ائمہ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا، اسے واضح فرمایا اور فقہاء اور اہل حدیث کو نقطہ عدل پر لانے کے لئے بھرپور مساعی کیں۔ اس سلسلے میں آپ کی تصنیفات میں سے الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، عقد الجید فی بیان احکام الاجتہاد والتقلید، حجۃ اللہ البالغۃ حصہ اول کے آخری ابواب، تفہیمات الٰہیہ کے کچھ حصے اور ازالۃ الخفاء کے بعض ضمنی مباحث کارآمد ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے موطا امام مالکؒ کی دو شرحیں مسویٰ اور مصفیٰ کے نام سے لکھی ہیں، ان میں آپ نے حدیث کے صحیح مفہوم سمجھنے کا جو طریقہ بتایا ہے اور فقہ و حدیث میں تطبیق پیدا کرنے کی

جو راہیں کھولی ہیں، سچ تو یہ ہے کہ یہ شاہ صاحبؒ ہی کا حصہ ہے۔ یہ تحریرات فقہاء (اهل الرای والاجتهاد) اور اہل حدیث ہر دو فریق کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔

پیش نظر رسالہ "فقہی اختلافات کی اصلیت" اردو ترجمہ "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے احکام شرعیہ کے متعلق ائمہ اربعہ کے باہمی اختلاف کے اسباب وعلل پر بحث کی ہے اور تاریخی واقعات کا حوالہ دے کر اس اختلاف کی وجوہ کو نہایت معقول اور مدلل پیرایہ میں مفصل بیان کیا ہے اور تدوین فقہ کے ارتقائے منازل کی نہایت خوبی کے ساتھ نشاندہی کی ہے۔ فقہاء (اہل الرائے والاجتهاد) اور اہل حدیث کے جداگانہ مسلک کی جو اصل حقیقت ہے اسے اچھی طرح واضح کیا ہے اور فریقین کے افراط وتفریط پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ باوجود صغیر الحجم ہونے کے جس مقصد کیلئے لکھی گئی ہے اس کے کسی پہلو کو بھی روشن کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ فقہاء اور اہل حدیث دونوں کے لیے اس کا پڑھنا بے حد مفید ہے بشرطیکہ وہ یہ قصد کر کے نہ آئیں کہ خواہ کچھ بھی ہو، اپنی جماعت کے مسلمات کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔

رسالہ مذکور میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "تخریج اور استنباط (جو فقہاء کا مسلک ہے) اور تتبع الفاظ حدیث (جو اہل حدیث کا مسلک ہے) ان دونوں کی اصل، دین میں موجود ہے۔ ہر دور کے فقہاء محققین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ان دونوں اصولوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ کوئی ایک کی زیادہ رعایت کرتا، کوئی دوسرے کی۔ پس کسی کے لیے سزاوار نہیں ہے کہ وہ بالکل ایک ہی طرف جھک جائے جیسا کہ آج

دونوں فریقوں کا عام شیوہ ہے۔حق کا راستہ یہ ہے کہ ان میں تفریق کرنے کی بجائے دونوں میں مطابقت پیدا کی جائے، اور ایک سے دوسرے کے کمزور مقامات کی اصلاح کی جائے۔

اسی کے پیش نظر امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں:"خدائے وحدہ لا شریک کی قسم تمہارا راستہ حد سے بڑھنے والے اور حد تک نہ پہنچنے والے کے بیچ میں ہے"۔پس جو اہل حدیث ہیں انہیں چاہیے کہ اپنے اختیار کردہ مسلک کو مجتہدین سلف کی رائے پر پیش کر لیا کریں۔اس طرح جو اہل تخریج ہیں، انہیں بھی چاہیے کہ وہ اخبار و آثار کی اتنی واقفیت ضرور رکھتے ہوں کہ کسی حدیث صحیح صریح کی مخالفت نہ کر بیٹھیں۔جس مسئلہ میں کوئی قابل استناد حدیث یا اثر موجود اور محفوظ ہو اس کے خلاف اپنی رائے پر عمل نہ کریں"۔ (الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ص36)

ایک ہی فقہی مذہب ہونے کے بارے میں شاہ صاحبؒ نے ایک اہم تجویز پیش کی ہے۔تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابو حنیفہ اور شافعی رحمتہ اللہ علیہما کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔سب سے زیادہ پیرو بھی ان دو کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں۔۔۔۔

اس وقت جو امر ملا اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔دونوں کے مسائل کو حدیث نبیؐ کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔

جو کچھ ان کے موافق ہو، وہ باقی رکھا جائے اور جس کی اصل نہ ہو، اس کو ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں اگر وہ دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہیں تو وہ اس قابل ہیں کہ ان کو دانتوں سے پکڑ لیا جائے اور اگر دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلہ میں دونوں قول تسلیم کئے جائیں اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے۔ یا تو ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے قرآن مجید میں اختلاف قراءات کی حیثیت ہے، یا رخصت اور عزیمت کا فرق ہوگا، یا کسی مخمصہ سے نکلنے کے دو راستوں کی سی نوعیت ہوگی جیسے متعدد کفارات، اور یا دو برابر کے مباح طریقوں کا سا حال ہوگا۔ ان چار پہلوؤں کے باہر کوئی پہلو ان شاء اللہ تعالیٰ نہیں پایا جائے گا۔

(تفہیمات الٰہیہ، جلد اول ص، 211-212)

الغرض فقہ کے باب میں شاہ صاحبؒ نے نہایت معتدل مسلک پیش کیا ہے جس میں کسی ایک مذہب کی جانبداری اور اس کے مخالف مذہب میں نکتہ چینی نہیں پائی جاتی۔ وہ مذاہب کا محاکمہ کرتے ہیں اور ہر ایک کو اس کے افراط و تفریط سے ہٹا کر دونوں کو نقطہ عدل پر جمع کرنا چاہتے ہیں اور یہی مسلک ان کے اس رسالہ "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں عیاں ہے کہ طریق اہل حدیث اور طریق اہل تخریج دونوں کو جمع کیا جائے۔ اس مسلک معتدل کے اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ تعصب، تنگ نظری، تقلید جامد اور لاطائل بحثوں میں تضیع اوقات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مسلمانوں میں اختلافات کم ہوں گے اور وسعت نظر کے ساتھ تحقیق اور اجتہاد کا راستہ کھل جائے گا۔

علماء اکیڈمی محکمہ اوقاف پنجاب، اسلام کے مختلف پہلوؤں پر جامع، مستند اور مفید کتابیں شائع کر رہی ہے۔ 1971ء میں محکمہ اوقاف پنجاب کی طرف سے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کا اصل عربی متن شائع ہوا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ 1981ء اور 1989ء کے بعد اب تیسری بار خوبصورت انداز میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اردو ترجمہ اکیڈمی کے ایک فاضل متخصص جناب محمد عبید اللہ بن خوشی محمد نے کیا۔ انہوں نے اپنے امتحانی تقاضا کو پورا کرنے کے لیے یہ کام کیا تھا جسے اکیڈمی نے مفید پا کر اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ کتاب کے آخر میں قارئین کے فائدہ کے لئے شخصیات، کتابیات، مقامات اور آیات و احادیث کا اشاریہ جناب محمد نسیم عباسی سابق آفیسر تحقیق و مطبوعات علماء اکیڈمی نے مرتب کیا۔ مطبوعات اوقاف کے حوالے سے محترم جناب سید شفیق حسین بخاری سیکرٹری / ناظم اعلیٰ اوقاف کی سرپرستی بالخصوص قابل تحسین ہے۔

ڈاکٹر طاہر رضا بخاری

ربیع الاول 1423ھ — ڈائریکٹر مذہبی امور اوقاف پنجاب لاہور

تقریظ

از ڈاکٹر ظہور احمد اظہر (ستارہ امتیاز)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

اما بعد:۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف امام ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی ایک بہت ہی مفید اور اہم کتاب ہے۔ فقہی مسائل کے سلسلے میں علمائے اسلام کے ہاں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کے اسباب اور تاریخی پس منظر کا مطالعہ ایک دلچسپ اور وسیع موضوع ہے۔ اس موضوع پر متعدد علماء نے قلم اٹھایا ہے مگر شاہ صاحبؒ کا انداز بیان اور طریقہ استدلال سب میں منفرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصول فقہ کے ضمن میں اس کتاب کو بہت وقیع اور اہم مقام حاصل ہے۔

عزیزم مولانا محمد عبید اللہ صاحب نے اس اہم اور مفید کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جسے میں نے شروع سے آخر تک بغور پڑھا ہے۔ بہت عمدہ اور معیاری ترجمہ ہے۔ بعض مقامات پر مترجم نے مفید حواشی بھی لکھے ہیں جن سے کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔

وطن پاک میں شریعت اسلامی کے احیاء اور نفاذ کی جو کوشش ہو رہی ہیں اس کے ضمن میں یہ کتاب ہر خاص و عام کے لیے مفید ہو گی، یہ ترجمہ ایک اہم ضرورت پوری کرے گا، میری رائے میں مترجم اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس اہم و مفید کام کو احسن طریق سے انجام دیا۔ اس کتاب کی از سر نو طباعت و اشاعت کے حوالے سے شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف پنجاب کی مساعی جمیلہ بالعموم اور محترم جناب سید شفیق حسین بخاری سیکرٹری و ناظم اعلیٰ اوقاف و عزیزم ڈاکٹر طاہر رضا بخاری ڈائریکٹر مذہبی امور اوقاف پنجاب کی کوششیں بالخصوص قابل تحسین ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اس علمی سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ جزاه الله خير جزاء عنا و عن جميع المسلمين

تقریظ

پروفیسر منظور احسن عباسی

(مترجم کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم اما بعد

یہ مختصر سی کتاب نابغہ روزگار حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی 1176ھ مطابق 1763ء کی تالیفات میں سے رسالہ "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کا اردو ترجمہ ہے۔

علماء اکیڈیمی اوقاف کے ایک نوجوان ہونہار مفتش مولانا محمد عبید اللہ (بن خوشی محمد) نے نہایت خوبی، روانی اور تسلسل عبارت کی شیرینی کو قائم رکھتے ہوئے زیر نظر ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے۔ اس کتاب کے تراجم اس سے پہلے بھی ہو چکے ہیں لیکن ہر ترجمہ کی افادیت اور جاذبیت کے مدارج مختلف ہیں۔ کسی بھی شہ پارہ کلام کو خواہ کتنی ہی زبانوں اور کتنے ہی اسلوب میں ادا کیا جائے، قارئین و سامعین کے دلوں پر جداگانہ اثر ہوتا ہے۔

نیازمند کو یہ پورا ترجمہ لفظاً لفظاً پڑھنے اور اصل متن سے اس کی مطابقت کا موقع ملا، نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ترجمہ حسن ادا اور صحت اظہار کے لحاظ سے حرف آخر ہے۔ تاہم افادیت اور دلنشینی کے اعتبار سے اردو زبان میں ایک منفرد پیرایہ اظہار ہے۔

"الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کی ان تصانیف میں سے ہے جس کی عہد حاضر میں سب سے زیادہ اہمیت ہے کیونکہ ملت اسلامیہ ان دنوں جس ذہنی اور سیاسی بحران سے دوچار ہے، اس سے عہدہ برآ

ہونے کے لئے افرادملت میں باہمی یگانگت واخوت اوراتحادواتفاق کی سخت ضرورت ہے۔اورکسی مقصدکاحصول اس وقت تک محال ہے جب تک کہ عقائد میں یکجہتی نہ ہو۔

اس سے انکارنہیں ہوسکتا کہ امت مسلمہ اختلاف طبائع کے باعث چھوٹی بڑی مختلف جماعتوں میں بٹی ہوئی ہے۔سیدھا سادہ اورقدرتی ذریعہ اس سے نجات پانے کا وہی ہے جس کی طرف رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رہنمائی فرمائی ہے کہ "سواداعظم کا اتباع کرو" بلاشبہ نفسیاتی طور پر اس راہ میں مشکلات ہیں کیونکہ تمام مسلمانوں کے ایک ہی مرکز خیال پر جمع ہوجانے کے لئے ایک نصاب، عمل اور نفسیاتی وتکنیکی جدوجہد کی ضرورت ہے اوراس کی ابتدااسباب اختلاف کی تفتیش وتحقیق ہی سے ممکن ہے۔شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے دوسوسال پہلے اس نکتے کومحسوس فرمایا اور یہ کتاب اس لیے تالیف فرمائی کہ سب سے پہلے ان اسباب کو دیکھا جاسکے جو اختلاف کے اسباب ہیں۔پھران اسباب کی اہمیت پرغورکیا جائے ایسا نہ ہوکہ سبب نزاع توکچھ نہ ہواورنزاع وشقاق برپا ہوجائے۔جیسا کہ آج کل معاشرہ کی بیشتر الجھنوں کا حال ہے۔واقعات بتاتے ہیں کہ بے شمارقتل کی بنامحض حماقت ہے جومعمولی معاملات، لین دین درشتی مزاج، الزام تراشی، بداخلاقی اوربچوں کے باہمی جھگڑے کی بناپرہورہے ہیں، جن کا سدباب ممکن تھااور نہیں کیا گیا۔

بالکل اسی طرح شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں نہایت وضاحت سے بتایاہے کہ ایک قوم، ایک مذہب، ایک قرآن، ایک پیغمبراورایک اللہ پرایمان رکھنے والے کیسی کیسی معمولی باتوں اورجزئیات اعمال میں الجھ کربنیادی مقاصددین سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

کتاب کے آخری حصہ میں انہوں نے بعض ائمہ مسالک کی حیرت انگیز رواداری کاذکرفرمایاہے کہ ائمہ علماءنے کسی جماعت کے سربراہ بزرگ کے محض احترام

میں اپنے مسلک کو نظر انداز کر دیا۔ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے ادنیٰ مقصد کی قربانی کرنے کے اس طریق عمل ہی کو اگر اختیار کر لیا جائے تو فرقہ بندی کے بہت سے اسباب کی بیخ کنی ہو سکتی ہے۔

افراد ملت اگر شاہ صاحبؒ کی صرف اس دینی رہنمائی پر عمل پیرا ہو جائیں تو یقین ہے کہ اتفاق و اتحاد ملت کے مقصد میں ایک نمایاں پیش رفت ہو گی اور اس کتاب کا اصل مقصد پورا ہو جائے گا۔

سوانح شاہ ولی اللہ دہلویؒ

شاہ ولی اللہؒ کی مثال شجرہ طوبیٰ کی ہے کہ اس کی جڑ اپنی جگہ پر ہے لیکن اس کی شاخیں مسلمانوں کے ہر گھر میں ہیں۔(1)

امام مجدد احمد بن عبدالرحیم المعروف شاہ ولی اللہ دہلویؒ شوال 1114ھ مطابق 1702ء دہلی کے قریب ایک بستی میں پیدا ہوئے اور 29 محرم 1176ھ مطابق 1763ء کو بعمر 61 سال وفات پائی۔(2) ان کا خاندان علم وتقویٰ میں مشہور تھا۔ ان کے والد اپنے وقت کے عالم اور بزرگ صوفی تھے (مشہور کتاب) "فتاویٰ ہندیہ" کی تدوین ان کی رہین منت ہے۔

خاندان ولی اللہ کے بہت سے اشخاص آج تک برصغیر پاک و ہند میں دعوت اسلام کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

انہوں نے اپنی تالیف "الامداد فی ماثر الاجداد "میں بتایا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

ان کا زمانہ جیسا کہ ان کی تالیفات سے ظاہر ہے تعصب و جہالت کا زمانہ تھا۔ مختلف جماعتیں، جہاد (سعی تحفظ دین) سے دور ظلم گوارا کر لینے والی اور حاکم وقت کے خلاف آمادہ فساد تھیں۔ طوائف الملوکی کا یہ عالم تھا کہ امام موصوف کی زندگی ہی میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے بیس بادشاہ تخت نشین ہوئے۔

ان تلخ واقعات سے ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ موجودہ حالات میں ایسی تبدیلی لائی جائے کہ نظام عالم سے یہ صورت حال دور ہو جائے اور اسباب مرض سامنے آجائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تمام تر توجہ جہاد (فی الدین) کے تصور کو مسلمانوں میں اجاگر کرنے کی طرف مرکوز رہی جیسا کہ آپ کی تالیفات واقوال سے

ظاہر ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے عہد شباب میں انگریز کا راج عروج پر پہنچ گیا اور اس کی ابتدا اوج کمال پر پہنچ گئی۔ چنانچہ ان کی زندگی ہی یعنی 1763ء میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

شاہ صاحبؒ نے شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے تعلیم حاصل کی جو حدیث میں اپنے وقت کے امام تھے۔ 1142ھ میں سفر حجاز کا قصد کیا، دو سال حجاز میں رہے اس دوران بہت سے علماء سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ منجملہ ان کے مشہور ترین عالم ابو طاہر محمد بن ابراہیم المدنی تھے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ مجھ سے کسی لفظ کے معنی دریافت کیئے جاتے تو میں اس کے معنی کی تصدیق ان سے کراتا تھا۔

(ہندوستان واپس آنے کے بعد) 1719ھ میں انہوں نے اپنے والد کے مدرسہ (مدرسہ رحیمیہ) میں اپنے والد کی بجائے تدریس کے فرائض سنبھالے۔ تخت دہلی پر سلطان محمد شاہ کی تخت نشینی کا سال تھا جو شاہ ولی اللہؒ کے وجود پر نازاں تھا۔ اس نے انہیں شاہ جہان آباد (دہلی) میں اپنا ایک مدرسہ قائم کرنے کی پوری پوری حمایت کی۔ انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ جو اس وقت ہندوستان کی سرکاری زبان تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ماخذ اصلیہ سے دین کی تعلیم حاصل کر سکیں نہ یہ کہ نام نہاد پیر و صوفیاء سے جنہوں نے دین کے نام سے بدعتوں کو رائج کر رکھا تھا، اس وقت کے علماء آپ کے اس عمل سے برہم ہو گئے اور انہوں نے حاکم وقت کو ان کے خلاف ابھارا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ان کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے گئے۔ شاہ صاحبؒ اس وقت کے ہندی معاشرہ سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستان میں سب سے بڑی مصیبت جو مسلمانوں کو لاحق ہے اور معاشرے کو جس امر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ

بدعت اور بت پرستانہ رسوم کی مکمل بیخ کنی ہے۔ یہ خرابیاں اہل اسلام میں ہندوستان اور دوسرے ممالک کے بت پرستوں (اور مشرکین) کے ساتھ باہمی میل جول کا نتیجہ تھیں۔

21 ذوالحج 1144ھ (مطابق 5 مئی 1731ء) میں انہوں نے ایک مسلح انقلابی تحریک کی قیادت سنبھال لی تاکہ فساد ختم ہو جائے۔ دراصل یہ تحریک پانچ سال پہلے اسی وقت سے جاری تھی جبکہ انہوں نے قرآن حکیم کا فارسی میں ترجمہ کیا اور 1826ء میں شمالی ہند کے بعید علاقوں کے لیڈر سید احمد کی سربراہی میں ایک وقتی حکومت کا اعلان کر دیا گیا جس کی کیفیت یہ ہے:

امام ولی اللہ دہلویؒ	1731ء تا 1763ء
امام عبدالعزیزؒ	1763ء تا 1824ء
امام محمد اسحاقؒ	1824ء تا 1846ء

یہ انقلابی حکومت 1144ھ سے 27 ذی قعدہ 1246ھ تک رہی۔ 6 مئی 1831ء کو بالاکوٹ کے مشہور معرکہ میں سید احمد کو شہید کر دیا گیا لیکن یہ تحریک اب تک جاری ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تالیفات میں سب سے اہم تالیف "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس کے بارے میں شیخ سید سابق نے اپنے پیش لفظ میں کہا ہے کہ "حجۃ اللہ البالغہ" فلسفہ تشریع اسلامی اور شریعت کے اسرار کے علم میں شاہ ولی اللہ کی نادر اور اپنے موضوع میں نئی اور سب سے پہلی کتاب ہے جس کا اسلوب ادب عربی کے لحاظ سے منفرد ہے۔ عبارت کتاب کی شیرینی، منطقی استدلال اور قوی دلائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف علوم عقلیہ اور فکر اسلامی میں کمال مہارت کے حامل تھے۔

شاہ ولی اللہؒ کی عربی تصانیف کی تعداد سو سے زائد ہے، ان میں سے حسب

ذیل عربی زبان کی تالیفات دستیاب ہیں:

1۔ الفتح المنیر (فی غریب القرآن)
2۔ حجة الله البالغه (فی اسرار الشریعة)
3۔ البدور البازغة (علم کلام میں)
4۔ الخیر الکثیر
5۔ تفہیمات الہیه
6۔ فیوض الحرمین (فی المشاہدات و المعارف الروحیة)
7۔ المسوّی فی شرح موطا امام مالك
8۔ النوادر من حدیث سید الاوائل والاواخر
9۔ الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین
10۔ الاربعون حدیثا (بالاشراف فی غالب حدیثها)
11۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین
12۔ الارشاد الی مهمات علم الاسفاد
13۔ تراجم البخاری
14۔ شرح تراجم بعض ابواب البخاری
15۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف (مابین فقہاء و مجتہدین)
16۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید
17۔ القول الجمیل (در تصوف و سلوک)
18۔ لمعات (مخطوطہ ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوا)
19۔ تاویل الاحادیث (انبیاءؑ کے واقعات کے بیان میں)

20- السّر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم

21- المکتوب المدنی (فی حقائق التوحید)

22- المکتوبات (وہ خطوط جنہیں حافظ محمد رحیم دہلوی نے جمع کیا)

23- حسن العقیدہ (فی العقائد)

24- اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم

25- المقدمۃ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیہ

26- الزہراوین (سورۃ البقرۃ اور آل عمران کی تفسیر)

27- شفاء القلوب (حقائق و معارف میں)

28- دیوان الشعر العربی (دیوان عربی، ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیزؒ نے جمع کیا) اس کے علاوہ فارسی زبان میں بے شمار تصانیف ہیں۔

حواشی

1۔نزہتہ الخواطر (عربی) ج6،ص406

2۔عمر شریف شصت و یک سال و چہار ماہ شد، چہارم شوال تولد گشت و در بست و نہم محرم وفات یافت۔ تاریخ تولد چہارم ماہ شوال، چہار شنبہ 1114ھ بود تاریخ وفات او بود امام اعظم دیں۔1176ھ۔ (ملفوظات عزیزیہ،ص40)

(مقالہ احمد راتب عرموش (ماخوذ از کتاب الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف (عربی)،ص 7،طبع دار النفائس بیروت 1977ء)

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدلله الذی بعث محمد اصلوات اللہ علیه (و علی آله و صحبه و سلم) الیٰ الناس لیکون هادیاً الیٰ الله باذنه و سراجاً منیراً۔ ثم الهم الصحابة و التابعین والفقهاء المجتهدین ان یحفظوا سرّ نبیهم طبقة (بعدطبقة) الی ان یوذن الدنیا بانقضاء لیتم، تعمة و کان علی کل (شی) قدیرا۔ واشهد ان لا اله الا اللّه وحده لا شریك له واشهدان سیدنا محمداً عبده و رسوله الذی لا نبی بعده صلی اللّه علیه وآله واصحابه اجمعین۔ امام بعد۔

خدائے کریم کی رحمت کا محتاج فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں دونوں کو اپنی نعمت کامل سے نوازے یوں عرض پرداز ہے کہ ایک وقت ایسا آیا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو ایسا معیار سمجھایا جس سے مجھے ان تمام اختلافات کی وجہ جو ملت محمدیہ علی صاجہا الصلوٰۃ والتسلیمات میں واقع ہوئے معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک حق کیا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس قابل بھی کر دیا کہ میں ان کی اس طرح وضاحت کروں کہ اس کے بعد کوئی شبہ واشکال باقی نہ رہے۔ لوگ مجھ سے یہ پوچھتے تھے کہ آیا صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد والوں میں باہم اختلاف رائے کا سبب کیا تھا خاص کر امور فقہیہ میں۔ چنانچہ وقتی طور پر سائل کی نوعیت کے پیش نظر جو کچھ میری سمجھ میں آتا ان کی راہنمائی کرتا۔ یہاں تک کہ اس باب میں ایک مفید رسالہ (زیرنظر) تیار ہوگیا۔ جس کا نام میں نے "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" (یا اختلاف کے موزوں اسباب) رکھا۔ حسبی اللہ و نعم الوکیل ولا حول و لا قوة الا باللّه العلی العظیم۔

باب اول

فروعات میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے اختلاف کے اسباب کا بیان

واضح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں علم فقہ بحیثیت فن مدوّن نہ تھا اور نہ اس وقت احکام (شرعیہ) کے بارے میں بحث کا وہ طریق تھا جو بعد میں رائج ہوا کہ فقہا اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر کے مدلل طور پر کسی حکم کے ارکان و شرائط و آداب بیان کرتے ہیں، فرضی مسائل سامنے رکھ کر ان پر بحث کرتے ہیں اور اشیاء کی جامع مانع تعریف بیان کرتے اور جن امور پر کسی مسئلہ کا انحصار ہے، اسے واضح کرتے ہیں وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ سلم وضو فرماتے صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریق وضو دیکھ کر اسے اختیار کر لیتے بغیر اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بتاتے کہ فلاں کام وضو میں لازمی ہے اور فلاں کام (لازمی تو نہیں) بہتر ہے۔

اسی طرح آپ نماز پڑھتے اور صحابہ کرامؓ آپ کو نماز پڑھتے دیکھتے اور جس طرح آپؐ نماز پڑھتے اسی طرح خود بھی ادا کرتے۔ نیز انہوں نے جس طرح آپؐ کو حج کرتے دیکھا اسی طرح خود بھی حج کرنے لگے۔

الغرض آپؐ کا عام طریقہ تعلیم یہی تھا آپؐ نے کبھی یہ بیان نہیں فرمایا کہ وضو کے چار یا چھ فرض ہیں اور نہ کبھی آپ نے یہ گمان کیا کہ ہوسکتا ہے کبھی کوئی شخص

اعضائے وضو کو پے در پے نہ دھوئے جس کی وجہ سے وضو کے درست ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔ اس بارے میں شاذونادر ہی کچھ فرمایا کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ آپؐ سے ایسے سوالات بھی بہت کم کرتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ "میں نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ سلم سے بہتر کوئی جماعت نہیں دیکھی۔ انہوں نے آپؐ سے پوری زندگی میں تیرہ سوال پوچھے ان سب کا ذکر قرآن مجید میں ہے منجملہ ان کے "یسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه قل قتال فيه كبير"(1) یعنی اے نبی لوگ آپؐ سے حرمت کے مہینوں کے متعلق پوچھتے ہیں کہ ان میں جنگ کرنا کیسا ہے آپ فرما دیجئے اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے) اور "ویسئلونك عن المحيض "(2) (یعنی وہ آپ سے مسائل حیض پوچھتے ہیں)

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "صحابہ کرامؓ صرف وہی مسائل پوچھتے جو سودمند ہوں (بے فائدہ سوالات نہیں کرتے تھے)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "ایسی بات کی بابت مت پوچھو جو فی الواقع پیش نہ آئی ہو کیونکہ میں نے والد گرامی (عمر بن الخطابؓ) کو اس شخص پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے جو ایسے سوالات کرتا ہے۔

قاسمؒ کہتے ہیں کہ تم لوگ ایسے سوال کرتے ہو جن کے متعلق ہم نے کبھی سوال نہیں کیا تھا اور تم ایسی باتوں کو کریدتے ہو جنہیں ہم نہیں کریدا کرتے تھے اور تم وہ باتیں پوچھتے ہو جن سے ہمیں سابقہ نہیں پڑا، اگر ایسا ہوتا تو اس کا چھپانا روا نہ ہوتا (یعنی بے مصرف سوالات کرتے ہو)۔

عمر بن اسحٰقؒ فرماتے ہیں کہ مجھ کو اکثر صحابہ کرامؓ سے شرف ملاقات حاصل

ہے میں نے صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر کسی گروہ کو سہولت پسند اور دشواری سے مجتنب نہیں پایا۔

عبادہ بن نسی الکندیؒ سے یہ فتویٰ پوچھا گیا کہ "اگر کسی عورت کا ایسی جگہ انتقال ہو جائے جہاں اس کا کوئی ولی نہ ہو تو اسے غسل کیسے دیا جائے؟

آپ نے فرمایا میں ایسے لوگوں (صحابہ کرامؓ) سے ملا ہوں جو تمہاری طرح دشوار پسند نہیں تھے اور نہ وہ اس قسم کے فرضی مسائل پوچھتے تھے جیسے کہ تم پوچھتے ہو۔ ان روایات کو امام دارمیؒ نے (اپنی مسند) میں نقل کیا ہے۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان ہی مسائل کی بابت لوگ سوال کرتے تھے جن سے سابقہ پڑتا تھا اور آپ فتویٰ دیتے۔ اسی طرح مقدمات آپ کی خدمت میں پیش ہوتے آپ ان کا فیصلہ فرما دیتے۔ آپ لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھتے تو تعریف فرماتے اور برے کام کرتے دیکھ کر اظہار ناپسندیدگی فرماتے۔

اور یہ تمام فتویٰ پوچھنا، مقدمہ پیش ہونا، یا اظہار پسند و ناپسندیدگی بالعموم اجتماع عام میں ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کو (اپنے خلافت کے زمانہ میں) جب کسی مسئلہ میں حکم شرعی معلوم نہ ہوتا تو دیگر صحابہ کرامؓ سے دریافت فرماتے کہ اس کی بابت حضور پاک سے کچھ سنا ہے؟ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے جب دادی کی وراثت کا مسئلہ پیش ہوا تو فرمایا کہ میں نے اس کی بابت حضور اکرمؐ کا کوئی حکم نہیں سنا اس لئے میں دیگر صحابہ سے پوچھتا ہوں جب آپؓ نے ایک بار نماز ظہر کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی نے رسول اکرمؐ سے دادی کے حق وراثت کے بارے میں کوئی ارشاد سنا ہے؟ تو مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا "میں نے سنا ہے" فرمایا کیا سنا ہے؟ مغیرہ بن شعبہؓ نے جواب دیا۔

رسول اکرمؐ نے دادی کو چھٹا حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا یہ بات تمہارے علاوہ کسی اور کو بھی معلوم ہے؟ محمد بن مسلمہؓ بولے! مغیرہ بن شعبہؓ نے صحیح فرمایا ہے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عورت کو (جو متوفی کی دادی تھی) چھٹا حصہ دے دیا۔

نیز غرّہ (3) (جنین کے خون بہا) (4) کی بابت بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہؓ سے استفسار کے بعد مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت پر عمل کا ارادہ فرمایا۔

اسی طرح وبا (5) کے متعلق حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی بیان کردہ حدیث کے مطابق فیصلہ فرمایا نیز مجوسیوں (6) کے معاملہ میں بھی ان ہی (عبدالرحمٰنؓ بن عوف) کے روایت کردہ ارشاد نبویؐ کے مطابق فیصلہ فرمایا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (7) معقل بن یسار کی روایت سن کر جو ان کی رائے کے مطابق نکلی تھی، بے حد خوش ہوئے اور ایسا ہی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (8) کا واقعہ ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دروازے پر (تین بار آواز دینے کے بموجب ارشاد نبویؐ) واپس جانے لگے تو آپ نے گھر سے نکل کر ان سے واپسی کی وجہ دریافت کی انہوں نے ارشاد نبویؐ پیش کیا اور حضرت ابوسعیدؓ نے بھی تصدیق کی تو آپ نے اسے تسلیم کر لیا اور ایسی بہت سی مثالیں صحیحین اور سنن میں مذکور ہیں۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کا بالعموم دستور مبارک یہی تھا چنانچہ ہر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپؐ کی عبادات، فتوؤں میں سے جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں میسر ہوا، وہ دیکھا پھر انہیں یاد بھی رکھا اور قرائن سے اس کا سبب معلوم کیا پس بعض کو اباحت (9) پر، بعض کو استحباب (10) پر اور بعض امور کو علامات اور قرائن کی بنا پر جو ان کے نزدیک کافی تھے، منسوخ قرار دیا۔ اس بارے میں انہوں

نے اپنے وجدان اور اطمینان قلب پر اعتماد کیا اور استدلال کے طریقوں کی طرف ان کی توجہ نہ تھی چنانچہ سیدھے سادے اعرابیوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ آپس کی باتوں کو سمجھ لیتے ہیں اور تصریح نیز اشارات و کنایات سے نجانے کس طرح انہیں اطمینان خاطر ہو جاتا ہے۔

عہد رسالت تک تو لوگوں کا یہی حال رہا پھر صحابہ کرامؓ کو مختلف علاقوں سے سابقہ پڑا اور بکثرت واقعات رونما ہوئے اور بہت سے مسائل پیش آئے جن کی بابت ان سے فتوے پوچھے جاتے چنانچہ ہر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ استفتاء کا وہی جواب دیتا جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فتوؤں اور فیصلوں کو یاد رکھا تھا یا ان سے استنباط کیا تھا اور اگر آپ کے فیصلوں اور فتوؤں اور اپنے استنباط میں کوئی ایسی چیز نہ پاتا جس کی بنا پر جواب دے سکتا تو اپنی ذاتی رائے سے کام لیتا اور اس علت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشادات کی بنیاد بنایا ہو پھر جس مقام پر ان کو وہ علت نظر آتی وہاں وہی حکم عائد کر دیتے اور اس میں صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصد کے مطابق ہو۔

اندریں حالات صحابہؓ کے درمیان جو باہمی اختلاف کا آغاز ہے۔ اس کی چند بنیادیں تھیں ایک تو یہ کہ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی قضیے میں آپؐ کا کوئی فیصلہ یا ارشاد سنا مگر دوسرے نے نہیں سنا اور اپنے اجتہاد سے کام لیا جس کی چند صورتیں پیش آئیں۔

ایک یہ کہ وہ اجتہاد حدیث نبویؐ کے مطابق نکلا۔ اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو امام نسائیؒ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک عورت کے بارے میں استفسار کیا گیا جس کا خاوند فوت ہو گیا تھا اور اس کا مہر مقرر نہیں ہوا تھا۔ آپ نے

جواب دیا کہ ایسے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی فیصلہ مجھے معلوم نہیں۔ لوگ ایک ماہ تک ان کے ہاں آتے رہے اور اصرار کرتے رہے آخر انہوں نے اجتہاد کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اس عورت کو مہر مثل (11) ملنا چاہیئے ، نہ کم نہ زیادہ، نیز اسے عدت گزارنا ہوگی اور شوہر کی وراثت سے حصہ بھی پائے گی۔ یہ سن کر حضرت معقل بن یسارؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے بطور شہادت فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے قبیلہ کی ایک عورت کے بارے میں ایسا ہی فیصلہ فرمایا۔ اس گواہی کے سبب حضرت ابن مسعودؓ کو اتنی خوشی ہوئی کہ بقول ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اب تک ایسی خوشی حاصل نہ ہوئی تھی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ دو صحابیوں میں کسی مسئلہ کے متعلق بحث ہوئی اور اس ضمن میں کوئی ایسی حدیث سامنے آجاتی جس کی صحت کا ظن غالب ہوتا چنانچہ صحابی اپنے اجتہاد سے رجوع کر کے سنی ہوئی حدیث کو اختیار کر لیتا مثلاً وہ حدیث جس کو ائمہ حدیث نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا خیال تھا کہ "جو شخص طلوع صبح کے وقت تک جُنُبی رہا اس کا روزہ نہیں ہوتا" جب بعض ازواج مطہرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ان کے خیال کے خلاف بیان کیا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے طرز فکر سے رجوع کر لیا۔

سوم یہ کہ اگر ایک صحابی کو کوئی حدیث پہنچتی مگر اس کی صحت کا گمان غالب نہ ہوتا تو وہ صحابی اپنا اجتہاد ترک نہ کرتا اور اس روایت کو نادرست قرار دیتا۔ اس کی مثال فاطمہ بن قیس کی وہ حدیث ہے جسے اصحاب (12) اصول نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ فاطمہ (بنت قیس) نے حضرت عمر بن الخطابؓ کے روبرو آکر کہا کہ "مجھ کو تین طلاقیں دی گئی تھیں _ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لا سکنی ولا نفقة" (یعنی اب نہ تو رہائش کی حقدار ہے نہ نفقہ کی)۔ حضرت عمرؓ نے اس کا بیان

ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم ایک عورت کے قول کے سبب کتاب اللہ (13) کو نہیں چھوڑ سکتے خبر نہیں کہ وہ سچی ہے یا جھوٹی۔ تین طلاقیں پانے والی کو نفقہ بھی ملنا چاہیئے اور رہائش بھی۔ نیز ان ہی فاطمہ کے قول کو سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "فاطمہ (بنت قیس) کو کیا ہو گیا کہ وہ اللہ کا خوف نہیں کرتی اور کہتی ہے۔" لا سکنی ولا نفقہ" (یعنی مطلقہ ثلاثہ کو مکان اور نفقہ کا حق نہیں ہے)۔

اس کی ایک مثال شیخین (بخاریؒ و مسلمؒ) کی یہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کا خیال تھا کہ اگر جُنبی کو غسل کے لیے پانی نہ ملے تو وہ تیمّم سے پاکی حاصل نہیں کر سکتا لیکن جب حضرت عمار بن یاسرؓ نے بیان کیا کہ وہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمسفر تھے اور مجھے غسل کی حاجت ہو گئی لیکن پانی نہ مل سکا انہوں نے مٹی میں لوٹ پوٹ لگائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے اس عمل کا تذکرہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کر لینا کافی تھا (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور اپنے چہرہ مبارک اور ہاتھوں پر مسح کیا۔ حضرت عمرؓ نے عمار بن یاسرؓ کے اس بیان کو تسلیم نہیں کیا اور کوئی غیر واضح ضعف کے سبب جو ان کو اس روایت میں نظر آیا ان کے نزدیک یہ روایت دلیل نہ ٹھہری اگرچہ بعد کے طبقہ میں یہ حدیث دوسرے بکثرت طریقوں سے مشہور ہو گئی۔ اس کے ضعیف ہونے کا وہم ماند پڑ گیا اور لوگ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔

اختلاف کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابی تک سرے سے کوئی حدیث پہنچی ہی نہ ہو مثلاً امام مسلمؒ کی یہ روایت کہ "حضرت عبداللہ بن عمرؓ عورتوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ وہ جب غسل کریں تو اپنے سر کے بال کھول لیں" جب حضرت عائشہؓ نے یہ سنا تو فرمایا" تعجب ہے کہ ابن عمرؓ عورتوں کو بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں وہ یہ کیوں نہیں کہتے کہ عورتیں اپنے سر ہی منڈا لیں۔ حالانکہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کرتے اور میں اس کے سوا کچھ نہ کرتی کہ اپنے بالوں پر تین بار پانی بہالیتی (اور بال کھولتی نہیں تھی)۔

ایک اور مثال ہے جس کا ذکر امام زہریؒ نے کیا کہ ہندؓ کو یہ علم نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استحاضہ (14) کی حالت میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے اس لیئے وہ اس حالت میں نماز نہ پڑھتیں اور ترک نماز کے غم سے رویا کرتی تھیں۔

احکام فقہ کے متعلق صحابہ کرامؓ میں جو اختلاف ہوئے ان کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک عمل کرتے دیکھا لیکن اس عمل کی حیثیت کے تعین میں اختلاف ہوگیا۔ بعض نے اس فعل رسول کو کار ثواب خیال کیا اور بعض نے ایک امر جائز سمجھا اس کی ایک مثال عمل تصحیب ہے۔ جسے اصحاب اصول (محدثین) نے بیان کیا ہے۔ عمل تصحیب سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر حج کے دوران البطح کی وادی میں فروکش ہوئے۔ اب آپؐ کا وہاں پر اترنا حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک تو یہ کار ثواب تھا لہذا انہوں نے اسے حج کی سنتوں میں شمار کیا مگر حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک وہاں پر اترنا محض ایک اتفاقی امر تھا نہ کہ کسی ثواب کے طور پر۔

ایک اور مثال یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک طواف میں رمل (اکڑ کر چلنا) سنت ہے اور ابن عباسؓ کا مسلک یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فعل رمل ایک وقتی ضرورت کے تحت اتفاقیہ کیا تھا۔ یعنی مشرکین (مکہ) کا یہ طعن کہ "مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے کمزور کر ڈالا ہے" (بایں سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو اکڑ کر چلنے کا حکم دیا ورنہ) یہ عمل حج کی سنّت نہیں ہے۔

ایک اور اختلاف جو کسی واقعہ کی تعبیر میں وہم (غلط فہمی) کی وجہ ہوسکتا ہے

اس کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کیا اور لوگوں نے آپؐ کو حج کرتے دیکھا بعض نے کہا کہ آپؐ متمتع (15) تھے (یعنی حج تمتع ادا کر رہے تھے) اور بعض نے کہا کہ آپ قارن (16) تھے (یعنی حج قران ادا کر رہے تھے) اور بعض اس طرف گئے کہ آپ مفرد (17) (یعنی حج افراد ادا کر رہے تھے)۔

ایک اور مثال حضرت سعید بن جبیرؓ کی وہ روایت ہے جسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں (سعید بن جبیرؓ) نے عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ اے ابوالعباس (18)! مجھے تعجب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (احرام حج کے بعد) جو تلبیہ فرمایا اس کے متعلق اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں وقت تلبیہ کے تعین میں اختلاف ہے (اتفاق رائے نہیں ہے) تو حضرت ابن عباسؓ نے کہا "میں اس کی بابت سب سے زیادہ جانتا ہوں اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حج کیا اسی لئے صحابہؓ میں اس کی تفصیلات کے متعلق (قدرتی طور پر) اختلاف ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کی خاطر مدینہ سے چلے جب مسجد ذی الحلیفہ میں دو رکعت نماز ادا فرمائی تو وہیں حج کا احرام باندھا اور نماز سے فارغ ہوتے ہی (الفاظ) تلبیہ (یعنی لبیك اللھم لبیك لا شریك لك لبیك ان الحمد والنعمة والملك لك لا شریك لك) کہنا شروع کر دیا۔ اس تلبیہ کی آواز جن لوگوں کے کانوں تک پہنچی انہوں نے اسے حفظ کر لیا پھر آپؐ اونٹنی پر سوار ہو گئے۔ جب اونٹنی آپؐ کو لے کر چلی تو پھر آپؐ نے تلبیہ کہا اور اس تلبیہ کو بھی بعض لوگوں نے سنا۔ بات یہ ہے کہ لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں خدمت نبوی میں آئے تھے اسی لئے جب ایک گروہ نے اونٹنی کے روانہ ہوتے وقت آپ کو تلبیہ کہتے سنا تو انہوں نے سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے۔ پس جب بیداء (19) کی بلندی پر چڑھے تو تلبیہ کہا اسے بھی کچھ

لوگوں نے سنا انہوں نے یہ سمجھا کہ آپؐ نے تلبیہ صرف اس وقت کہا جب آپؐ بیداء کی بلندی پر چڑھ رہے تھے حالانکہ بخدا آپؐ نے اپنی جائے نماز پر حج کی نیت کر لی تھی اور تلبیہ کہا (یعنی الفاظ تلبیہ ادا فرمائے) پھر جب اونٹنی آپؐ کو لے چلی تو تلبیہ کہا اور جب بیداء کی بلندی پر چڑھے تو بھی تلبیہ کہا۔

منجملہ اسباب اختلاف سہو و نسیان بھی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عمرہ ماہ رجب میں کیا حضرت عائشہؓ نے یہ سنا تو انہوں نے فرمایا وہ بھول گئے ہیں۔

اختلاف کا ایک اور سبب خامی فہم حدیث (یا اخذ نتائج) ہے چنانچہ ابن عمرؓ یا حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ "میت کے گھر والوں کے رونے سے اس پر عذاب (20) ہوتا ہے"۔ حضرت عائشہؓ نے جب سنا تو کہا کہ وہ حدیث کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے، بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک یہودیہ کی قبر کے پاس سے گزرے، اس کے گھر والے اس پر رو رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "یہ اس پر رو رہے ہیں اور اسے قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ (21)" اس سے راوی نے یہ سمجھا کہ میّت کے عذاب کا سبب اس کے گھر والوں کا رونا ہے اور یہ گمان کر لیا کہ یہ حکم ہر میّت پر عائد ہوتا ہے۔

اختلاف کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کسی حکم کی علّت کے تعین میں اختلاف ہو گیا جیسے جنازہ کے لئے کھڑے ہونے کا مسئلہ ہے چنانچہ بعض صحابہؓ نے تو یہ کہا کہ (جنازے کو دیکھ کر کھڑا ہونا) فرشتوں کی تعظیم کے لئے ہے (جو جنازہ کے ساتھ ہوتے ہیں)۔ یہ حکم عام ہوا کہ میّت کافر کی ہو یا مسلمان کی۔ بعض نے کہا کہ موت کے ہول کے سبب۔ ان دونوں صورتوں میں عمومیّت حکم پیش نظر ہے لیکن حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے کہا "ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب سے

ایک یہودی کا جنازہ گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بُرا سمجھا کہ ایک یہودی کی لاش آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر سے اونچی ہو۔

ایک سبب اختلاف کا یہ بھی ہے کہ دو مختلف حکموں کے درمیان موافقت نہ کر سکے جیسا کہ جنگ خیبر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متعہ (وقتی نکاح) کی اجازت دینا۔ پھر جنگ اوطاس کے موقع پر بھی اس کی اجازت دے دی اور بعد میں اس سے منع فرما دیا۔ چنانچہ ابن عباسؓ کا کہنا ہے کہ اجازت متعہ ناگزیر حالات کے سبب تھی اور ممانعت ناگزیر صورت حال ختم ہو جانے کی وجہ سے ہے اور (ایسے حالات میں) یہ حکم بدستور باقی ہے لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس فعل کو روا رکھا گیا تھا اور جب ممانعت ہوئی تو یہ حکم ہمیشہ کے لئے منسوخ ہو گیا۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استنجاء کے وقت قبلہ رُو ہونے سے منع فرمایا ہے اس کے متعلق صحابہؓ کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ حکم عام ہے اور غیر منسوخ ہے لیکن حضرت جابرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وفات سے ایک سال قبل قبلہ رُو پیشاب کرتے دیکھا اس لئے ان کا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فعل سے پہلی ممانعت منسوخ ہو گئی اور ابن عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبلہ کی طرف پُشت اور شام کی طرف منہ کر کے قضائے حاجت کرتے دیکھا لہذا آپ نے بھی سابقۃ الذکر حکم کی تردید کی۔ بعض اصحاب نے دونوں روایتوں میں مطابقت کرنے کی کوشش کی چنانچہ شعبیؒ وغیرہ اس طرف گئے ہیں کہ ممانعت کا تعلق صحرا (کھلے میدان) سے ہے لہذا اگر آدمی بیت الخلاء میں ہو تو قبلہ کی طرف رخ ہونے یا پشت ہونے میں کوئی حرج نہیں اور کچھ لوگ اس طرف گئے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان (جس میں ممانعت ہے) قائم و ثابت ہے جس کا

حکم عام ہے اور فعل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اس لیئے فعل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قول رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہ تو ناسخ ہوگا اور نہ قول کو بعض مقامات کے ساتھ مخصوص کرنے والا۔

الغرض صحابہ کرامؓ کے مذاہب مختلف ہوگئے اور ان میں سے تابعین نے جس میں سہولت دیکھی، اختیار کرلیا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور صحابہؓ کے طریق کار سے جو کچھ جس نے سنا اسے یاد کرلیا۔ اس کے پابند رہے اور حتی المقدور ان میں باہمی مطابقت کی اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی (اور ایسا بھی ہوا) کہ ان کے نزدیک بعض اقوال اگرچہ وہ کبار صحابہؓ سے مروی تھے، کمزور قرار پائے۔ جیسا کہ جُنبی کے تیمّم کرنے کے متعلق حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ سے ان کا جو مسلک منقول ہے، وہ کمزور پڑ گیا اور عمارؓ اور عمران بن حصینؓ وغیرہ سے مروی احادیث پر عمل عام ہوگیا اور اس طرح علمائے تابعین میں سے ہر عالم کا اپنی اپنی توجیہ کے مطابق علیحدہ مسلک ہوگیا اور اس طرح ہر علاقے میں ایک امام بن گیا جیسے سعید بن المسیبؓ اور سالم بن عبداللہ بن عمرؓ ان کے بعد زہری اور قاضی یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن مدینہ میں، عطاء بن ابی رباح مکہ میں، ابراہیم النخعی اور شعبی کوفہ میں، حسن بصری بصرہ میں، طاؤس بن کیسان یمن میں، مکحول شام میں، امام بنے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کچھ دلوں کو ان (علمائے تابعین) کے علوم کا پیاسا (مشتاق) بنادیا اور وہ (ان علوم کی) تحصیل کی طرف راغب ہوئے اور انہوں نے ان (علماء) سے حدیث، صحابہؓ کے فتاوے اور ان کے اقوال نیز ان علماء (تابعین) کے اپنے مسالک اور تحقیقات کو جمع کیا، مستفتیوں نے ان سے فتوے پوچھے اور انہیں بے شمار مسائل سے سابقہ پڑا اور بہت سے معاملات اور فیصلے ان کے روبرو پیش ہوئے۔

سعید بن المسیبؒ اور ابراہیم نخعی اور ان جیسے (کبار علمائے تابعین) نے فقہ

کے ابواب جمع کئے اور ان کے پاس ہر باب میں کچھ اصول تھے جو انہوں نے سلف سے حاصل کئے تھے۔ اس سلسلہ میں سعید (بن المسیب) اور ان کے ہم خیال اصحاب کی رائے یہ تھی کہ حرمین شریفین کے رہنے والے تفقہ میں سب سے اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور ان کے مسلک کی بنیاد حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ کے فتاویٰ، ان کے فیصلے اور عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے فتاویٰ اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلوں پر تھی پھر جہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی انہوں نے ان فتوؤں کو جمع کیا اور انہوں نے گہری نظر سے جائزہ لیا۔ جس بات پر علمائے مدینہ کا اتفاق تھا اسے تو بڑی مضبوطی سے اختیار کر لیتے تھے اور جس امر کے بارے میں اختلاف تھا اس میں سے جو زیادہ قوی اور قابل ترجیح ہوتا تھا، اسے لے لیتے تھے خواہ اس وجہ سے کہ اکثریت اس طرف مائل تھی یا وہ بات قیاس قوی کے مطابق تھی یا وہ کتاب وسنّت سے واضح طور پر مستنبط (ماخوذ) تھی یا ایسی ہی کوئی وجہ سے۔

اور جہاں ان لوگوں نے کسی مسئلہ کا سلف سے ماخوذ جواب نہ پایا ان کے (سلف کے) کلام سے استنباط کیا۔ اشارۃ و اقتضاء کلام کی جستجو کی اور اس طرح ان کے ہاں ہر ہر باب میں بہت سے مسائل جمع ہو گئے۔

ابراہیم اور ان کے اصحاب کی رائے تھی کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے اصحاب (فیض یافتہ) فقہ میں ممتاز و مستحکم مقام رکھتے ہیں جیسا کہ علقمہ نے مسروق سے کہا کہ " کیا کوئی صحابہؓ میں سے عبداللہؓ (ابن مسعود) سے بڑھ کر فقہ میں قابلِ وثوق ہے؟ نیز امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے بھی اوزاعیؒ سے کہا کہ " ابراہیم (نخعی) سالم (بن عبداللہ بن عمرؓ) سے زیادہ فقیہ ہیں " اگر عبداللہ بن عمرؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا تو میں کہتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ فقیہ ہیں اور عبداللہ (ابن مسعودؓ) تو عبداللہ ابن مسعودؓ ہی ہیں (ان کا کیا کہنا)

امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلوں اور ان کے فتوؤں اور قاضی شریح اور دیگر قضاۃِ کوفہ کے فیصلوں پر ہے۔

پس (ابراہیم نخعیؒ نے) ان فتوؤں اور فیصلوں کو جہاں تک اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق دی فراہم کیا پھر ان کے آثار کے بارے میں وہی طرز اختیار کیا جو اہل مدینہ نے وہاں کے باشندوں کے آثار کے بارے میں اختیار کیا اور اسی طرح استنباط کیا جیسا کہ انہوں نے استنباط کیا پس ان کے پاس ہر مسئلہ میں فقہ کے ابواب مدوّن ہو گئے۔

سعید بن المسیّب فقہائے مدینہ کے ترجمان تھے حضرت عمرؓ کے فیصلے اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی احادیث انہیں سب سے زیادہ یاد تھیں۔ اسی طرح ابراہیمؒ (نخعی) فقہائے کوفہ کے ترجمان تھے اس لئے جب یہ دونوں کسی مسئلہ پر بات کرتے اور گو اسے کسی کی طرف منسوب نہ کرتے تاہم وہ اکثر اوقات سلف سے کسی کی طرف ضرور منسوب ہوتی چاہے صریحاً ہو یا اشارۃً یا اس سے ملتے جلتے کسی اور انداز سے (مثلاً اقتضائے حال وغیرہ)۔ ان دونوں بزرگوں کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے فقہاء نے ان کی فقہی آراء پر اتفاق کرلیا اور انہی سے انہوں نے اخذ مسائل کیا، سمجھا اور مزید استنباط کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حواشی

1) سورۃ البقرۃ:217

2) سورۃ البقرۃ:232

3) "غرہ" یعنی ایک غلام کو آزاد کیا جانے یا جنین کے ولی کو پچاس دینار یا پانچ صد درہم دیئے جائیں۔

4) خلیفہ ثانی بلا فصل حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے، جنین کے خون بہا کا مسئلہ پیش ہوا چونکہ آپ کو اس بارے میں کوئی ارشاد نبویؐ معلوم نہ تھا اس لئے آپؓ نے صحابہؓ سے پوچھا۔ مغیرہ بن شعبہؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا خون بہا مقرر کیا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔

5۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام میں جہاد کے لئے لشکر لئے جا رہے تھے راستہ میں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ صحابہ سے مشورہ کیا۔ کوئی بات طے نہیں ہو رہی تھی۔ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وبائی مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔

6۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ زمانہ خلافت میں مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے جب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیتے تھے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان پر جزیہ لگا دیا۔

7۔ یہ معاملہ ایک عورت کا تھا جس کا شوہر حال ہی میں فوت ہوا تھا۔ اس نے اس سے نہ مقاربت کی تھی نہ مہر مقرر کیا تھا۔ اس کی تشریح آگے آتی ہے۔

8۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر گئے تین بار آواز دی اندر سے جواب نہ ملنے پر ابھی چند قدم واپس گئے ہوں گے کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خادم سے کہا کہ انہیں اندر بلا لو جب خادم باہر آیا تو ابو موسیٰ اشعریؓ کو دروازے پر نہ پایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو پکار کر بلوایا اور واپس جانے کا سبب دریافت کیا۔ ابو موسیٰ اشعریؓ نے ارشاد نبویؐ پیش کیا کہ "جب تین بار آواز دینے کے باوصف اجازت نہ ملے تو دروازہ سے ہٹ جاؤ" حضرت ابو سعید خدریؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی توثیق کی۔

9۔ جس کا کرنا یا نہ کرنا برابر ہو۔

10۔جس کا کرنا بہتر ہو۔

11۔یعنی اس عورت کو اتنا مہر ملنا چاہیئے جتنا کہ اس کی ہم مرتبہ عورتوں کو ملتا ہے۔

12۔صحاح ستہ کے مؤلفین۔

13۔قرآن مجید کی آیت "ولا تخرجوھن من بیوتھن "اور دوسری آیت"اسکنو ھن من حیث سکنتم من وجد کم" سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقہ عورت کو عدت کے زمانہ تک گھر سے نہیں نکالنا چاہیے بلکہ خاوند پر لازم ہے کہ زمانہ عدت تک اس کے لئے رہائش مہیا کرے اور آیت "وانفقوا علیھن "کے تحت عورت کو زمانہ عدت تک نفقہ بھی ملنا چاہیئے۔

یہ آیات اپنے مفہوم میں عام ہیں ان میں طلاق رجعی والی عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کے اسی عموم کو سامنے رکھتے ہوئے فاطمہ بنت قیس کی روایت رد کردی کیونکہ وہ قرآن کے خلاف جارہی تھی۔

14۔حیض ونفاس کے ایام کے علاوہ جو خون آئے۔

15۔حج تمتع یہ ہے کہ کوئی شخص حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کرے اور احرام کھول دے پھر ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو حج کا احرام باندھے اور حج کرے۔

16۔حج قران یہ ہے کہ کوئی شخص عمرہ اور حج دونوں کا احرام باندھے اور دونوں کو ادا کرکے احرام کھولے۔

17۔حج افراد وہ حج ہے جس کے ساتھ عمرہ نہ کیا جائے۔

18۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی کنیت۔

19۔بیداء ایک جگہ کا نام ہے۔

20۔صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب البکاء عند المریض

21۔صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب الجنائز۔

باب دوم

مسالک فقہاء میں اختلاف کے اسباب

واضح ہو کہ تابعین کے دور کے بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشینگوئی کے مطابق علم کے حاملین کا گروہ پیدا کر دیا جن کی بابت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "ہر آنے والی نسل میں اس علم (دین) کے حامل عادل و امین ہوں گے" چنانچہ انہوں نے (تابعین سے) جن سے وہ مل سکے وضو، غسل، نماز، حج، نکاح، لین دین اور دوسرے کثیر الوقوع معاملات کا طریقہ حاصل کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث روایت کیں اور شہروں کے قاضیوں کے فیصلے اور مفتیوں کے فتوے سنے اور مسائل دریافت کئے اور ان تمام مسائل میں غور و فکر کیا جس سے وہ قوم کے بزرگ بن گئے اور امور شرعیہ میں ان کو مستند قرار دیا گیا۔ یہ لوگ اپنے شیوخ (بزرگوں) کے طریقے پر چلے اور ان احکام سے رہنمائی حاصل کرنے اور ان کے تقاضے معلوم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور اسی کے مطابق فیصلے کئے، فتوے دیئے، روایات بیان کیں اور ان کی تعلیم دی۔ ان علماء کا طریق کار ایک دوسرے سے مشابہ تھا۔ ان کے طریق کار کا حاصل یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث خواہ وہ مسند (جس کی سند پوری بیان ہو) ہو یا مرسل (جس کی سند میں تابعی صحابیؓ کو چھوڑ دے) اسے قبول کیا جائے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول باتیں ہیں جنہیں صحابہؓ نے مختصراً بیان کیا اور انہیں موقوف احادیث (جس میں صحابیؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر نہ کرے) بنا لیا جیسا کہ ابراہیمؒ (نخعی) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہ روایت بیان کی جس میں محاقلہ

(کچی کھیتی بیچنا) اور مزابنہ (درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوروں کو توڑی ہوئی خشک کھجوروں کے عوض بیچنا) سے منع کیا گیا اس پر ان سے کہا گیا۔ کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث یاد نہیں؟ آپ نے کہا ہاں (کیوں نہیں) لیکن میں کہتا ہوں (کہ یوں کہنا کہ) عبداللہ نے کہا یا علقمہ نے کہا میرے نزدیک (براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت کرنے سے) بہتر ہے۔ اسی طرح امام شعبیؒ سے جب ایک حدیث کے متعلق کہا گیا اور انہیں کہا گیا کہ اس حدیث کی سند نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچائی جائے تو انہوں نے اس سے انکار کرتے ہوئے جواب دیا کہ "مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں اس کی سند نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی برتر شخصیت تک لے جاؤں تا کہ اگر اس میں کوئی کمی بیشی ہو تو اس کی ذمہ داری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی اور شخص پر ہو یا یہ ہوگا کہ وہ مسائل کتاب و سنّت سے ان کے اخذ کردہ احکام اور ان کی اپنی اجتہادی رائے پر مشتمل ہوں گے۔ یہ بزرگ ان امور میں طریق کار کے لحاظ سے بعد کے آنے والے حضرات سے اچھے، باعتبار زمانہ مقدّم اور باعتبار علم افضل تھے۔ اس طرح ان احکام پر عمل کرنے کا تعین ہو جائے گا، بجز اس صورت کے جبکہ ان میں اختلاف ہو جائے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ان کے قول کی کھلم کھلا مخالف ہو۔

اگر کسی مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث مختلف ہوتیں تو وہ اصحاب اقوال صحابہؓ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ درآنحالیکہ کسی حدیث کو منسوخ یا قابل تاویل یا کسی تصریح کے بغیر ترک کرنے پر متفق ہوں۔ اس لئے کہ عدم قبول کا مطلب دراصل حدیث کو ضعیف یا منسوخ یا قابل تاویل قرار دینا ہے۔ ان تمام صورتوں میں یہ صحابہ کرامؓ کی پیروی کرتے تھے۔

یہی وہ بات ہے جو امام مالکؒ نے کتے کے جھوٹے کے حکم والی حدیث

(1) کے بارے میں کہی کہ یہ حدیث آئی ہے لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے یعنی ابن حاجب نے اس حدیث کی بابت مختصر الاصول میں بیان کیا ہے کہ میں نے اس پر سلف کو عمل پیرا نہیں دیکھا" اور بتایا ہے کہ اگر صحابہؓ اور تابعین کے مابین کسی مسئلہ کے بارے میں اختلاف ہوتا تو ہر عالم اپنے علاقے (شہر) کے عالم اور مشائخ کے مسلک کو اختیار کرتا کیونکہ وہ ان کے اقوال کے سقیم یا قابل وثوق ہونے سے زیادہ باخبر اور ان اقوال سے نسبت رکھنے والے اصولوں کا زیادہ راز داں ہوتا تھا اور اس کا دل اپنے علاقے کے اساتذہ کے فضل اور تبحر علمی کی جانب زیادہ مائل ہوتا تھا چنانچہ حضرات عمرؓ، عثمانؓ، عائشہؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ اور ان کے شاگرد مثلاً سعید بن المسیّب جو حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایتوں کے سب سے زیادہ حافظ تھے یا مثلاً حضرات عروہؒ، سالمؒ، عکرمہؒ، عطاء بن یسارؒ، قاسمؒ، عبیداللہ بن عبداللہؒ، زہریؒ، یحیٰی بن سعیدؒ، زید بن اسلمؒ اور ربیعہ وغیرہم کا مسلک ہے جو اہل مدینہ کے لیے دوسروں سے زیادہ قابل قبول تھا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس امر کو اہل مدینہ کے فضائل میں بیان فرمایا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ مدینہ ہر زمانہ میں فقہاء اور علماء کا مرکز رہا۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ اہل مدینہ کے طریق استدلال کا التزام فرماتے تھے اور امام مالکؒ کے متعلق یہ مشہور ہو گیا کہ وہ اہل مدینہ کے اجماع کو حجت مانتے ہیں چنانچہ امام بخاریؒ نے (اپنی صحیح میں) ایک باب باندھا ہے "باب فی الاخذ بما اتفق علیه الحرمان" یعنی جس بات پر اہل مکہ و اہل مدینہ دونوں کا اتفاق ہو اسی کو اختیار کرنے کا بیان۔

اور عبداللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب کا مذہب حضرت علیؓ، شریح رحمتہ اللہ علیہ اور شعبیؒ کے فیصلے اور ابراہیم (نخعی) کے فتاوے اہل کوفہ کی نظر میں دیگر اقوال و مذہب کی نسبت زیادہ قابل ترجیح ہیں یہی بات تھی جس کے باعث علقمہ نے تشریک

(شراکت اراضی، یعنی مالک اراضی کا اپنی زمین بٹائی پر کاشت کے لیے کسی کو دے دینے) کے مسئلہ میں مسروق کو زید بن ثابت کے قول کی طرف مائل دیکھ کر یہ بات کہی تھی کہ " کیا کوئی صحابی عبداللہ بن مسعودؓ سے زیادہ باوثوق ہے "مسروق نے جواب دیا" ایسا تو نہیں ہے لیکن میں نے زید بن ثابت اور دیگر اہل مدینہ کو شراکت (یا زمین کو بٹائی پر دیتے) دیکھا ہے "۔

غرض اہل شہر (مدینہ) جس بات پر متفق ہوتے یہ علماء مضبوطی سے اس پر جم جاتے تھے اور امام مالکؒ بھی یہی کچھ فرماتے ہیں کہ جس سنّت کے بارے میں (باشندگان مدینہ کے درمیان) کوئی اختلاف نہیں وہی ہمارے نزدیک ایسی ایسی (یعنی قابل وثوق) ہے اور اگر اہل مدینہ کا کسی معاملہ میں اختلاف رائے ہوتا تو جو رائے زیادہ قوی اور قابل ترجیح ہوتی اس کو اپنا لیتے اس کا طریقہ یا تو یہ تھا کہ وہ دیکھتے کہ اکثریت کس طرف ہے یا یہ کہ کون سا قول قوی قیاس پر مبنی ہے یا کونسا مسلک کتاب وسنّت سے اخذ کیا گیا ہے۔ اسی کے بارے میں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ "یہ جو میں نے سنا سب سے اچھی بات ہے" پھر جب علماء اپنے شہر کے صحابہ وتابعین کے اقوال وآثار میں جو کچھ انہوں نے سن رکھا ہے کسی مسئلہ کا جواب نہ پاتے تو ان کے کلام سے استنباط مسائل کرتے اور ان کے اشارات ومقتضیات کی پوری تلاش کرتے۔ یہی وہ طبقہ علماء ہے جن کے دل میں تدوین فقہ کا خیال منجانب اللہ آیا۔ چنانچہ امام مالکؒ اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی زویبؒ نے مدینہ میں، ابن جریجؒ اور ابن عینیہؒ نے مکہ میں اور امام ثوریؒ نے کوفہ میں اور ربیع بن الصبیحؒ نے بصرہ میں فقہ کی تدوین کی اور ان سب (بزرگوں) کا طریقہ تدوین وہی تھا جو اوپر بیان ہوا۔

واضح ہو کہ جب (خلیفہ) منصور حج کے لئے گیا تو اس نے امام مالکؒ سے کہا کہ "میں چاہتا ہوں کہ آپ نے جو یہ کتاب (مؤطا امام مالک) تصنیف کی ہے

اس کے بہت سے نسخے نقل کراؤں اور مسلمانوں کے ہر علاقے میں ایک ایک نسخہ بھیج دوں اور حکم دے دوں کہ وہ اس کتاب پر عمل کریں اور اسے چھوڑ کر کسی اور طرف نہ جائیں۔ امام مالکؒ نے جواب دیا۔ اے امیر المؤمنین! ایسا نہ کیجیئے کیونکہ لوگوں کے پاس سلف کے اقوال اس سے قبل پہنچ چکے ہیں اور انہوں نے احادیث نبویؐ سنی ہیں اور روایتیں بیان کی ہیں اور ہر قوم نے وہ بات لے لی جو اس تک پہلے پہنچی اور لوگوں کے اختلاف کے باوصف انہوں نے ان پر عمل کیا اسی لیے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اور اس پر عمل کرنے دیجیئے جو ہر علاقے نے اپنے لیئے اختیار کر لیا ہے۔ یہ قصہ ہارون الرشید کی طرف بھی منسوب ہے کہ ہارون الرشید نے امام مالکؒ سے بطور مشورہ کہا کہ آپ کی تدوین کردہ مؤطا کو کعبہ میں لٹکا دیا جائے اور لوگوں کو کہا جائے کہ اسی کے مطابق عمل کریں؟ امام مالکؒ نے کہا ایسا نہ کیجیئے کیونکہ فروعی مسائل میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ خود مختلف الرائے تھے اور اسی حالت میں وہ مختلف علاقوں میں پھیلے یہ انہی کے طریقے ہیں جو مختلف علاقوں میں نافذ ہیں۔ ہارون الرشید نے کہا "اے ابو عبداللہ (امام مالکؒ کی کنیت) خدا تعالیٰ آپ کو توفیق عمل بخشے۔

اس واقعہ کو جلال الدین سیوطیؒ نے نقل کیا ہے۔

امام مالکؒ ان احادیث کے سب سے بڑے عالم ہیں جو اہل مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیں اور ان کی مرویات بلحاظ اسناد سب سے زیادہ معتبر ہیں اور پھر حضرت عمرؓ کے فیصلوں، عبداللہ بن عمرؓ اور عائشہ صدیقہؓ اور ان حضرات کے ساتوں (2) شاگردوں کے اقوال کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ ان سے اور ان جیسی دیگر مبارک ہستیوں نے علم روایت اور فتویٰ کی بنیاد ڈالی۔ جب انہیں مسند درس و تدریس سونپی گئی تو انہوں نے حدیثیں بیان کیں، فتوے دیئے اور علم کے دریا بہا دیئے۔

اور امام مالکؒ پر ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد صادق آتا ہے کہ "وہ زمانہ قریب ہے جب لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی جستجو میں جدوجہد کریں گے اس وقت وہ مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی کو زیادہ عالم نہیں پائیں گے" جیسا کہ ابن عینیہؒ اور عبدالرزاقؒ جیسے صاحب الرائے پر اعتماد ہونا چاہیے۔ بعدازاں امام مالک کے تلامذہ نے ان کی روایات اور ان کے اختیار کردہ اقوال کو جمع کیا۔ ان کی تلخیص کی، انہیں تحریر کیا، ان کی شرح کی، ان سے مسائل مستنبط کئے اور ان کے اصول و دلائل پر بحث کی۔

امام مالکؒ کے تلامذہ مغربی علاقوں (مراکش و اندلس) اور زمین کے دوسرے حصوں میں پھیل گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی مخلوق کو ان سے نفع پہنچایا۔ اگر آپ ہمارے بیان کی صداقت چاہتے ہیں تو ان کی کتاب مؤطا امام مالک دیکھ لیجیے آپ اسے ایسا ہی پائیں گے جیسا ہم نے بیان کیا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ ابراہیم نخعیؒ اور ان کے ہمعصروں کے مسلک پر قائم رہے کبھی کبھار ہی اس سے تجاوز کیا اور اس مسلک کے اصولوں پر مسائل کی تخریج میں آپ کا مقام بڑا بلند تھا اخذ مسائل میں آپ بہت دِقت نظر سے کام لیتے اور جزئیات پر بھی پوری توجہ تھی اگر آپ کو ہمارے اس قول کی صداقت مطلوب ہے تو امام محمدؒ کی کتاب الآثار، عبدالرزاقؒ کی جامع مصنف، ابوبکر بن ابی شیبہؒ اور ابراہیم نخعیؒ کے اقوال جمع کر لیجئے پھر امام ابوحنیفہؒ کے مسلک سے ان کا مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بہت کم باتوں میں ابراہیمؒ (نخعی) کے راستے سے ہٹتے ہیں اور فقہائے کوفہ کے مذہب سے باہر نہیں جاتے۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سے سب سے مشہور ابو یوسف رحمہ اللہ تھے جو ہارون الرشید کے عہد حکومت میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بنائے گئے اور انہی

کے باعث حنفی مسلک عراق وخراسان اور ماوراء النہر میں زیادہ پھیلا اور اسی پر عمل ہوا۔

اور امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ میں بہ اعتبار تصنیف و تالیف و درس وتدریس سب سے بڑھ کر امام محمدؒ تھے۔ ان کے حالات زندگی یہ ہیں کہ انہوں نے فقہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سے حاصل کی۔ پھر مدینہ چلے گئے وہاں امام مالکؒ سے مؤطا پڑھی بعدازاں بطور خود غور وفکر کیا اور اپنے شیوخ کے مسالک کے ایک ایک مسئلہ کو مؤطا سے مقابلہ کر کے دیکھا اگر دونوں میں موافقت ہوئی تو خیر ورنہ وہ دیکھتے کہ صحابہؓ و تابعینؒ میں کچھ حضرات ان کے شیوخ کے مسلک کی طرف گئے ہیں تو مسئلہ کو ویسا ہی رہنے دیتے اور اگر انہوں نے اپنے شیوخ کے قیاس کو کمزور اور استنباط میں ناقص اور ایسی صحیح حدیث کے خلاف پایا جس پر کہ فقہاء نے عمل کیا یا یہ دیکھا کہ اکثر علماء کا عمل ان کے شیوخ کے خلاف ہے تو اسے ترک کر کے مسالک سلف میں سے وہ مسلک اختیار کر لیا جو ان کے نزدیک موجودہ مسلک سے قابل ترجیح ہوا۔ ان دونوں اصحاب (قاضی ابو یوسفؒ و امام محمدؒ) نے ابراہیم نخعیؒ اور ان کے ہمعصر شیوخ کی حتی الامکان (بحد مناسب) پیروی کی ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ کرتے تھے ان کا اختلاف دو صورتوں میں سے ایک میں ہوتا تھا یا تو ایسا ہوتا کہ ان کے استاد (امام ابوحنیفہؒ) نے ابراہیم نخعیؒ کے مسلک پر کسی مسئلہ کی تخریج کی لیکن ان دونوں شاگردوں کو اس سے اتفاق نہ ہوا۔ یا ایسا ہوتا کہ ابراہیم نخعیؒ اور ان ہی جیسے فقہائے کوفہ کے مختلف اقوال ہوتے اور دونوں شاگردان ابوحنیفہؒ ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے میں اپنے استاد سے اختلاف کرتے۔

امام محمدؒ نے اپنی تالیفات میں تینوں کی آراء جمع کر دیں جس سے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا پھر اصحاب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان تصنیفات کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی تلخیص و تفہیم اور تشریح وتخریج کی، اس کی بنیادی حیثیت قائم فرمائی اور

ان سے استدلال کیا۔ اس کے بعد یہ لوگ خراسان اور ماورآء النہر کی طرف پھیل گئے اوران مسائل کوابو حنیفہؒ کا مسلک کہا جانے لگا۔

اوراس طرح امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مسالک کو بھی امام ابو حنیفہؒ کا مسلک شمار کیا جانے لگا حالانکہ یہ دونوں خود مستقل مجتہد تھے اور ان کے باہم اختلافات تھوڑے نہیں ہیں۔ یہ اختلافات اصول میں بھی ہیں اور فروع میں بھی، لیکن (ان کو ایک ہی مسلک شمار کرنے کی) وجہ یہ ہے کہ تینوں میں ابراہیم نخعیؒ کے مسلک کو اپنی بنیاد قرار دینا مشترک ہے، دوسرے یہ کہ مبسوط اور جامع کبیر میں ان تینوں کے مسالک کو یک جائی طور پر جمع کر دیا گیا۔

امام شافعیؒ (3) کا ظہور مذہب مالکی اور مذہب حنفی کے اصول وفروع کی ترتیب کے آغاز میں ہوا۔ امام شافعیؒ نے اپنے پیش روؤں کے طریق کار کو دیکھا اور اس میں ایسی چیزیں پائیں جس نے ان کی راہ چلنے سے روک دیا اس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب "الام" میں کیا ہے۔ منجملہ ایسی باتوں کے امام شافعیؒ نے دیکھا کہ ان سے پہلے مرسل ومنقطع (4) حدیث کو بھی لیا جاتا رہا جس کے سبب ان کے مسالک میں خلل واقع ہوا۔ کیونکہ جب احادیث کی اسناد جمع کی جاتی ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سی احادیث مرسل ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں اور بہت سی مرسل احادیث مسند احادیث کے خلاف پڑتی ہین لہذا امام شافعیؒ نے یہ طے کیا کہ وہ کسی مرسل حدیث کو نہ لیں گے جب تک کہ وہ چند شرائط پر پوری نہ اترے جن کی تفصیل اصول حدیث کی کتب میں مذکور ہے۔

ان (شرائط) میں سے ایک یہ ہے کہ (ماضی میں) مختلف نصوص میں تطبیق دینے کے قوائد منضبط نہ تھے بایں سبب ان کے اجتہاد غلطیوں سے مبرا نہ رہ سکتے تھے اس لئے امام شافعیؒ نے یہ اصول وضع کئے اور ایک کتاب (الرسالة) کی صورت میں

مرتب کی یہ پہلی کتاب تھی جو اصول فقہ میں مرتب ہوئی۔

امام شافعیؒ کے خیال (اجتہاد میں غلطی کے امکان) کی ایک مثال جو ہمیں معلوم ہے یہ ہے کہ ایک دن امام شافعیؒ امام محمدؒ کے پاس گئے۔ امام محمدؒ فقہائے مدینہ پر اعتراض کر رہے تھے کہ وہ ایک گواہ اور مدعی کی قسم پر فیصلہ کر دیتے ہیں حالانکہ یہ کتاب اللہ (5) میں اضافہ ہے۔ امام شافعیؒ نے کہا کیا آپ کے نزدیک یہ ثابت ہے کہ خبر واحد (6) سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں؟ امام محمدؒ نے کہا "جی ہاں" امام شافعیؒ نے کہا تو پھر کس لیئے آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد "الا لا وصیة لوارث "(7) کو لے کر جو کہ خبر واحد ہے، وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں سمجھتے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "کتب علیکم اذا حضر احد کم الموت، ان ترک خیران الوصیة للوالدین والاقربین "(8) (تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کا وقت آ جائے اگر اس نے مال چھوڑا ہو تو اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لئے وصیت کر جائے) کیا یہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں؟ امام شافعیؒ نے اس طرح کی اور بھی مثالیں پیش کیں جس پر امام محمدؒ خاموش ہو گئے۔

ان مثالوں میں سے ایک یہ ہے کہ بعض صحیح احادیث ان علمائے تابعین تک جن کے فتوؤں پر بھروسہ کیا جاتا تھا نہیں پہنچی تھیں چنانچہ انہوں نے خود اجتہاد کیا یا عام اصولوں کی پیروی کی، پھر اپنے پیشرو صحابہؓ کے طرز عمل کو اختیار کیا اور اسی کے مطابق فتوے دیئے پھر جب تیسرے طبقے میں وہ احادیث ظاہر ہوئیں تو فقہاء نے ان پر عمل نہ کیا بدیں خیال کہ وہ احادیث ان علمائے شہر کے عمل اور طریق کار کے منافی ہیں جن میں ان کو کوئی اختلاف نہ تھا اور یہ بات حدیث کے لیے قابل اعتراض اور اسے قابل رد قرار دینا ہے۔

یا ایسا ہوا کہ وہ صحیح احادیث طبقہ ثالثہ میں مشہور نہیں ہوئیں بلکہ بعد میں جب اہل حدیث نے طرقِ حدیث (روایت احادیث کے طریقوں) کو جمع کرنا شروع کیا جس کے لئے وہ زمین کے کونے کونے میں پھرے اور علم حدیث (9) کے حاملین کو ڈھونڈا تو بیشتر حدیثیں ایسی نکلیں جن کی روایت کرنے والے صحابہؓ کی تعداد ایک یا دو سے زیادہ نہیں پھر ان صحابہؓ سے روایت کرنے والے بھی دو ایک ہی ہیں اور یہی صورت آگے تک تھی۔ جس کے باعث یہ احادیث عام اہل فقہ تک نہ پہنچ سکیں لیکن بعد میں بہت سی حدیثیں ان حافظان حدیث کے زمانہ میں مشہور ہوئیں جنہوں نے حدیثوں کو اُستاد کے ساتھ مختلف طُرق کے ساتھ جمع کیا مثلاً اہل بصرہ نے ایک حدیث روایت کی لیکن دوسرے علاقے کے لوگ اس سے بے خبر رہے لہذا امام شافعیؒ نے یہ صراحت کی ہے کہ صحابہؓ وتابعینؒ میں سے علماء کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ وہ ہر مسئلہ کے حل کے لیے حدیث تلاش کرتے اور جب حدیث نہ پاتے تو استدلال کی کسی اور نوع کو اختیار کرتے اور اگر بعد ازاں ان کو حدیث مل جاتی تو اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر حدیث کو اختیار کر لیتے ایسی صورت میں صحابہؓ وتابعینؒ کا کسی مسئلے میں حدیث سے تمسک نہ کرنا اس حدیث کو قابل اعتراض قرار دینا نہیں ہے تا آنکہ اس حدیث کے قابل اعتراض ہونے کی وجہ نہ بتائی جائے۔

حدیث قلتین (10) اس کی واضح مثال ہے یہ ایک حدیث ہے جو بہت سی اسناد سے روایت کی گئی ہے جن میں سے ایک بڑی مستند روایت وہ ہے جو ولید بن کثیر نے محمد بن جعفر بن زبیر سے اور انہوں نے عبداللہ یا محمد بن عباد بن جعفر سے اور انہوں نے عبید اللہ بن عبداللہ سے اور ان دونوں نے ابن عمرؓ سے روایت کی پھر اس سلسلہ میں اور بہت سی شاخیں نکلیں، یہ دونوں راوی (محمد بن جعفر بن زبیر اور محمد بن عباد بن جعفر) اگرچہ ثقہ ہیں لیکن ان میں نہیں جو فتویٰ دیتے اور مرجع خلائق ہوتے۔ اس لئے یہ

حدیث نہ تو سعید بن المسیب کے زمانہ میں مشہور ہو سکی نہ امام زہریؒ کے زمانہ میں نہ مالکیہ نے اس پر عمل کیا نہ حنفیہ نے لیکن امام شافعیؒ کے زمانہ میں یہ حدیث مشہور ہو چکی تھی اس لیے انہوں نے اس پر عمل کیا۔

ایک اور مثال "خیار مجلس" (11) والی حدیث ہے۔ یہ ایک صحیح حدیث ہے اور کثیر طرق سے مروی ہے اور صحابہؓ میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی عمل کیا لیکن چونکہ فقہائے سبعہ اور ان کے ہم عصر علماء تک نہ پہنچ سکی اس لیے اس کو اختیار نہیں کیا یہ چیز امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک موجب جرح (قابل بحث) بن گئی لیکن امام شافعیؒ نے اس پر عمل کیا۔

ایسی مثالوں میں ایک یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے زمانہ میں صحابہؓ کے اقوال جمع ہوئے جو بڑی تعداد میں تھے ان میں اختلافات اور شاخسانے نکل آئے۔ امام شافعیؒ نے ان کو ایسی احادیث صحیحہ کے مخالف پایا جو صحابہؓ تک نہیں پہنچی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ سلف ایسے معاملے میں حدیث کی طرف رجوع کر لیتے تھے اس لیے امام شافعیؒ نے صحابہ کرامؓ کے ان اقوال سے تمسک ترک کر دیا جن میں وہ متفق نہ تھے اور کہا کہ "ھم رجال و نحن رجال" (وہ بھی انسان تھے ہم بھی انسان ہیں جس طرح وہ مسائل کا استنباط کر سکتے ہیں، ہم بھی کر سکتے ہیں)۔

ایک اور مثال یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے دیکھا کہ بعض فقہاء شرعی رائے کو جسے شریعت کی حمایت حاصل ہے قیاس کے ساتھ خلط ملط کر لیتے ہیں اور دونوں میں امتیاز نہیں کرتے اور بعض اوقات اس کو استحسان کہتے ہیں حالانکہ رائے سے میری مراد یہ ہے کہ کسی حرج یا مصلحت کو حکم کی علّت قرار دیا جائے اور قیاس یہ ہے کہ منصوص حکم کی علت دریافت کر کے اس علت کو حکم کی بنیاد قرار دیا جائے۔

امام شافعیؒ نے اس طرز عمل کو بالکل غلط قرار دیا اور کہا کہ جو استحسان سے کام

لیتا ہے۔ وہ خود شارع (صاحب شریعت) بننا چاہتا ہے ان کے اس قول کو ابن الحاجب نے اپنی تالیف "مختصر الاصول" کی شرح میں بیان کیا ہے اس کی مثال رشد یتیم (یتیم کے صاحب فہم یا عاقل ہونے) کا مسئلہ ہے یتیم بچے کا معاملہ فہم ہو جانا ایک مخفی امر ہے بعض فقہاء نے دیکھا کہ بالعموم پچیس برس کی عمر میں انسان کے اندر معاملہ فہمی آجاتی ہے لہذا اس مظنہ رُشد پچیس سالہ عمر کو بنیاد قرار دے کر یہ اصول بنایا کہ جب یتیم اس عمر کو پہنچ جائے تب اس کا مال اسے واپس کر دیا جائے اور انہوں نے کہا کہ یہ استحسان (تقاضائے مصلحت) ہے اور تقاضائے قیاس یہ ہے کہ (محض عمر کی بنا پر) مال اس کے سپرد نہ کیا جائے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے جب اپنے پیشرو کی یہ باتیں دیکھیں تو انہوں نے علم فقہ پر نئے سرے سے نظر ڈالی اور اصول وضع کیے اور جزئیات متعین کیں اور اس موضوع پر انہوں نے بہترین کتابیں لکھیں اور لوگوں کو مستفید کیا چنانچہ فقہائے وقت آپ کے گرد جمع ہو گئے، انہوں نے امام شافعیؒ کی کتابوں کا اختصار کیا، ان کی تشریح کی اور ان سے استدلال کیا اور مسائل اخذ کئے۔ بعد ازاں مختلف علاقوں میں پھیل گئے اس طرح امام شافعیؒ کی فقہ کا ایک علیحدہ مسلک قرار پایا، واللہ اعلم بالصواب۔

حواشی

1۔ جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اسے سات بار دھودو، پھر ایک مرتبہ مٹی سے رگڑ کر صاف کرو (صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ باب حکم ولوغ الکلب)

2۔1۔سعید بن المسیب۔2۔عروہ بن زبیر 3۔عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ مسعودی۔4۔سلیمان بن یسار ہلالی۔5۔خارجہ بن زید بن ثابت 6۔ابوبکر بن عبدالرحمٰن مخزومی 7۔قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق۔

3۔ولادت 150ھ

4۔منقطع وہ حدیث ہے کہ اس کی سند متصل نہ ہو بلکہ کہیں نہ کہیں سے راوی ساقط ہو۔

5۔اس سے قرآن مجید کے حکم پر صحیح طور سے عمل نہیں ہوسکتا کوئی تخصیص کرنا پڑے گی وہ یہ کہ حلف کو دوسرے گواہ کے برابر سمجھا جائے گا جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے کہ اگر دو گواہ میسر نہ ہوسکیں تو اثبات مدعا کے لئے ایک گواہ اور دوسرا گواہ مدعی کی قسم کافی ہے۔

6۔خبر واحد وہ حدیث ہے جس کے راوی کثیر نہ ہوں۔

7۔سنن الترمذی کتاب الوصایا: باب ماجاء لا وصیۃ الوارث۔

8۔سورۃ البقرۃ:18

9۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل وتقریر کو حدیث کہتے ہیں اور کبھی صحابہ کرامؓ وتابعین عظامؒ کے قول وفعل وتقریر کو بھی حدیث کہتے ہیں لیکن بالعموم اسے خبر واثر کہا جاتا ہے۔

10۔حدیث یہ ہے: "اذا کان الماء قلتین لم یحمل خبثا" پانی جب دو قلہ ہو تو وہ نجاست کے پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا، قلۃ وہ مٹکا جس میں سوا چھ من یا پانچ سو رطل پانی آسکے (صحیح الترمذی، کتاب الطہارت، باب ماجاء ان الماء لا ینجسہ، شئی)

11۔جب تک مشتری وبائع الگ نہ ہو جائیں ان میں بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

باب سوم

اہل حدیث اور اصحاب رائے میں اختلاف کے اسباب

واضح ہو کہ سعید بن المسیبؒ، ابراہیم نخعی، زہریؒ، امام مالکؒ، سفیانؒ اور ان کے بعد کے دور میں بھی برابر ایسے علماء تھے جو شرعی امور میں رائے کے دخل کو ناپسند کرتے تھے اور ناگزیر صورت حال کے بغیر فتویٰ دینے اور مسائل مستنبط کرنے سے ڈرتے تھے۔ ان کی سب سے زیادہ توجہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وضاحت کی طرف ہوتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے (کسی امر کے متعلق) پوچھا گیا۔ انہوں نے جواب دیا" مجھے یہ ناپسند ہے کہ میں تمہارے لئے کسی ایسی چیز کو حلال کر دوں جسے اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کیا ہو یا کسی ایسی چیز کو حرام کر دوں جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو"۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کا کہنا ہے کہ "اے لوگو! بلا کے نازل ہونے کی جلدی نہ کرو (جب تک کہ کوئی مشکل پیش نہ آئے اس کے بارے میں مت پوچھو) کیونکہ مسلمانوں میں ایسے لوگ ہمیشہ موجور ہیں گے جن سے اگر کسی مسئلے کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ درست جواب دیں گے اسی طرح حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے کہ وہ ایسے امور کی بابت پوچھ گچھ ناپسند کرتے تھے جو وقوع پذیر نہ ہوئے ہوں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "تم بصرہ کے فقہاء میں سے ہو دیکھو جو فتویٰ بھی دو قرآن ناطق یا سنّت جاریہ ہی سے دینا، اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو خود بھی ہلاک ہو گے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے۔" ابونصر کہتے ہیں کہ جب

ابو سلمہ بصرہ پہنچے تو میں اور حسن (بصری) ان کے ہاں گئے انہوں نے حسن بصریؒ سے کہا کہ کیا آپ ہی حسن ہیں؟ مجھے بصرہ میں آپ کی ملاقات سے زیادہ اور کسی بات کا شوق نہ تھا اس لئے مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ آپ اپنی رائے سے فتویٰ دے دیتے ہیں اپنی رائے سے فتویٰ نہ دیں۔ فتویٰ دیجئے مگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یا نازل شدہ احکام قرآن مجید سے۔ ابن المنکدر کہتے ہیں کہ "عالم دین اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک واسطہ ہے (جس سے بندوں کو مرضیات الٰہی کا علم ہوتا ہے) پس اسے چاہیے کہ اس منصب سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے۔"

اور امام شعبیؒ سے سوال کیا گیا کہ جب آپ لوگوں سے مسائل پوچھے جاتے تھے تو آپ لوگ کیا کرتے تھے؟ امام شعبیؒ نے جوابدیا کہ وہ مسئلہ واقف کار پر ڈال دیا جاتا تھا کہ جب کسی شخص سے پوچھا جاتا تو وہ اپنے صاحب علم ساتھی سے کہتا کہ وہ جواب دیں اور یہ اسی طرح چلتا رہتا یہاں تک کہ وہ مسئلہ اسی کے پاس آ جاتا جس سے پہلے پوچھا گیا تھا۔

نیز امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ "یہ اصحاب جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بیان کریں، انہیں تسلیم کرو اور جو کچھ اپنی رائے سے کہیں اسے کوڑے میں پھینک دو۔"

ان تمام روایات کو امام دارمیؒ نے آخری عہد (روایات) میں نقل کیا ہے۔

اس کے بعد تو بلاد اسلامیہ میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آثار صحابہؓ کی تدوین شروع ہوگئی اور اس ضمن میں رسائل و کتب لکھنے کا اس قدر رواج ہوا کہ اہل روایت میں سے کوئی ایسا ہوگا جس کے پاس احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و آثار صحابہؓ کا کوئی مجموعہ یا کتاب جو اہم مواقع پر ان کی ضروریات پوری کر سکے، موجود نہ ہو۔ پھر اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء نے اسے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن

اور خراسان میں پھیلایا اور کتابوں کو جمع کیا ان کے مختلف نسخوں کو تلاش کیا اور غریب احادیث (1) اور نادر احادیث میں غور و خوض کیا۔ اس طرح ان کے اہتمام سے احادیث و آثار کا اتنا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ ان سے قبل کسی کے پاس جمع نہ ہوا تھا اور ان کو وہ بات حاصل ہوگئی جو کسی کو میسر نہ ہوئی چنانچہ انہیں خاص استناد کی وافر احادیث ہاتھ آ گئیں یہاں تک کہ بہت سی حدیثوں کی اسناد سو بلکہ اس سے بھی اوپر جا پہنچیں۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ حدیث کی بعض باتیں جو ایک روایت میں مخفی رہ گئی تھیں، دوسری روایت کے ذریعہ واضح ہو گئیں اور ان کے لئے یہ پہچاننا آسان ہو گیا کہ کونسی حدیث غریب ہے اور کونسی مستفیض (2) اور علماء کے لئے احادیث کے شواہد (3) و متابعات (4) (یک رنگی مفہوم ہم آہنگی رواۃ) میں غور و خوض ممکن ہو گیا۔ مزید برآں بہت سی احادیث صحیحہ کا انکشاف ہوا جو اہل فتویٰ کو اس سے قبل معلوم نہ تھیں چنانچہ امام شافعیؒ نے امام احمدؒ سے کہا کہ "آپ حضرات کو احادیث صحیحہ کا علم ہم سے زیادہ ہے اس لئے اگر کسی صحیح روایت کا علم آپ لوگوں کو ہو تو مجھے بتا دیں تا کہ میں اس کی پیروی کر سکوں وہ احادیث خواہ کوفی ہوں، بصری ہوں یا شامی۔ یہ بات ابن ہمام نے بیان کی ہے یہ انہوں نے اس لیے کہا کہ بہت سی احادیث صحیحہ ایسی ہیں جنہیں صرف خالص شہر مثلاً شام و عراق کے لوگ روایت کرتے ہیں یا ایک خاندان کے لوگ ہی بیان کرتے ہیں مثلاً "نسخہ برید" جو ابو بردہؓ سے مروی ہے اور انہوں نے ابو موسیٰؓ سے روایت کیا ہے اور "نسخہ عمرو بن شعیب" جسے عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے اور انہوں نے ان کے دادا سے بیان کیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ صحابی گمنام ہوں جنہیں حدیثیں بھی کم معلوم ہوں اور بہت کم لوگوں نے ان سے روایت کی ہو۔ یہ ایسی حدیثیں تھیں جن سے عام اہل فتویٰ غافل رہے لیکن ان کے پاس ہر علاقے کے فقہا کے آثار جمع ہو گئے وہ فقہاء صحابہؓ تھے یا تابعین۔ اور ان سے پہلے لوگ اپنے ہی شہر یا اپنے ہی اصحاب کی

احادیث جمع کر سکتے تھے ان سے پہلے کے لوگوں کے ہاں راویوں کے ناموں سے واقفیت اور ان کی عدالت کے مراتب کے علم کا دارومدار حالات وقرائن کے مشاہدہ پر تھا لیکن اس گروہ نے اس فن میں گہری نظر سے کام لے کر اسے تدوین وتفتیش کے لحاظ سے ایک مستقل حیثیت دے دی اور اس طرح پوری چھان بین کرنے سے حدیث صحیح اور غیر صحیح کا معیار دیا نیز اس تدوین و بحث کے سبب ابہام جاتا رہا اور یہ پتہ چل گیا کہ کون سی حدیث متصل (5) ہے اور کون سی منقطع۔ (6) ہر چند کہ سفیان ثوریؒ، وکیعؒ اور ان جیسے اور بزرگ بہت کوشش ومحنت کے باوصف ایک ہزار ایسی احادیث جمع نہ کر سکے جو متصل اور مرفوع (7) ہوں۔ اس کا ذکر ابوداؤد سجستانیؒ نے اپنے اس خط میں کیا ہے جو اہل مکہ کو لکھا تھا۔ حالانکہ اس طبقہ کے لوگ تقریباً چالیس ہزار احادیث روایت کرتے ہیں بلکہ امام بخاریؒ سے بطور صحیح مروی ہے کہ انہوں نے صحیح بخاری کو چھ لاکھ احادیث سے انتخاب کر کے مرتب فرمایا۔ اور ابوداؤد کے متعلق مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب "سنن" (8) کو پانچ لاکھ احادیث سے انتخاب کر کے مرتب فرمایا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند کو ایسا میزان قرار دیا ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو جانچا جا سکتا ہے یعنی جو حدیث ان کی مسند (9) میں ہے خواہ وہ ایک ہی سند سے مروی ہو (خبر واحد ہو) اس کی اصل ہے ورنہ اس کی کوئی اصل نہیں۔ ان اصحاب (تحقیق وتفتیش) میں یہ لوگ سرفہرست تھے۔ عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، یزید بن ہارونؒ، عبدالرزاقؒ، ابوبکر بن ابی شیبہؒ، مسددؒ، ہنادؒ، احمد بن حنبلؒ، اسحاق بن راہویہؒ، فضل بن وکینؒ، علی المدینی، اور ان کے ہم عہد دوسرے بزرگ۔

محدثین (10) کے طبقات میں یہ طرقہ صف اول میں تھا ان محققین نے جب فن روایت اور مراتب احادیث کو اچھی طرح متحقق کر لیا تب فقہ کی طرف متوجہ

ہوئے ان کے لیے یہ رائے قابل قبول نہ تھی کہ پچھلے اصحاب فقہ کے مسلک کی اجتماعی طور پر تقلید کریں اگر چہ ان مذاہب میں سے ہر مذہب کے اندر احادیث و آثار کے خلاف کچھ نہ کچھ مسائل دیکھے جا رہے ہوں اس لئے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور صحابہؓ، تابعینؒ اور مجتہدینؒ کے آثار کی ان قواعد کے مطابق جنہیں انہوں نے اپنے دلوں میں راسخ کر لیا تھا، تحقیق کی۔ میں انہیں سہولت فکر کے لئے بیان کرتا ہوں:

ان کے نزدیک جب کسی مسئلہ میں قرآن کی صراحت موجود ہو تو دوسری باتوں کی طرف متوجہ ہونا جائز نہیں ہے چنانچہ اگر قرآن میں کئی صورتوں کا احتمال ہو تو اس صورت میں سنّت کا حکم فیصلہ کن ہوگا۔ بنا بریں جب وہ کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہ پاتے تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار کرتے خواہ وہ تمام فقہاء میں مشہور و معروف ہو یا خواہ وہ کسی شہر یا کسی خاندان یا کسی طریق خاص تک محدود ہو اس پر صحابہؓ و فقہاء نے عمل کیا ہو یا عمل نہ کیا ہو۔ اور جب کسی مسئلہ کے متعلق حدیث موجود ہو تو اس کے سامنے کسی بھی روایت کا یا کسی اجتہاد کا جو مجتہد نے کیا ہو، اتباع نہ کرتے اور جب کسی امر میں وہ احادیث کی پوری تلاش کر لیتے اور اس مسئلہ کے بارے میں کوئی حدیث نہ ملتی تب ہی صحابہؓ و تابعینؒ میں سے کسی جماعت کے اقوال کو اختیار کیا جاتا۔ کسی مخصوص گروہ یا خاص شہر کے اہل علم پر انحصار نہیں کرتے تھے جیسا کہ ان سے پہلوں کا معمول تھا۔ اور اگر خلفاء اور فقہاء کسی امر پر متفق ہوتے تو اس کی اتباع کرتے۔ اگر ان میں اختلاف ہوتا تو ان میں سے ایسے بزرگ کی بات تسلیم کر لیتے جو تقویٰ، نیکوکاری اور حفظ مسائل میں فوقیت رکھتے ہوں یا پھر ان کی اس بات کو اختیار کرتے جو زیادہ مشہور ہوتی اور اگر کسی مسئلہ کے بارے میں اقوال مساوی حیثیت کے ہوں جسے مسئلہ ذات قولین (دو قولوں والا مسئلہ) کہا جاتا ہے اور اس میں بھی ترجیحی

فیصلہ سے عاجز ہوتے تو آیات قرآنی اور حدیثوں کی عمومیت، ان کے ارشادات اور ان کے مقتضیات پر غور کرتے اور درپیش مسئلہ کی نظائر کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتے اور اس مسئلہ کی نظیر کو کتاب وسنّت ہی قرار دیتے بشرطیکہ وہ نظیر اور مسئلہ زیر نظر تقریباً یکساں معلوم ہوتے ہوں۔ اس باب میں وہ بنیادی اصولوں کا اتباع نہیں کرتے تھے بلکہ سارا انحصار محض فہم اور اطمینان قلب پر کرتے تھے۔ جیسا کہ حدیث متواترہ (11) کی صحت کا انحصار راویوں کی تعداد اور ان کے حالات پر نہیں ہوتا بلکہ صحت حدیث کا انحصار اس اطمینان قلب پر ہے جو دل میں خود پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ صحابہؓ کے حالات کے بیان میں سابقاً توضیح ہو چکی ہے۔

یہ اصول وہ ہیں جن کا ماٰخذ اسلاف کا عمل اور ان کی تصریحات ہیں۔ میمون بن مہرانؒ بیان کرتے ہیں کہ "جب حضرت ابوبکرؓ کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو وہ قرآن میں غور کرتے اگر اس میں فیصلہ کن بات پا لیتے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے اگر کتاب (قرآن مجید) میں ایسی بات نہ ملتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث اس بارے میں دستیاب ہو جاتی تو اس حدیث کی بنیاد پر فیصلہ کرتے اگر اس کے حصول میں عاجز رہتے تو بیرون خانہ عام مسلمانوں سے دریافت فرماتے کہ میرے سامنے فلاں معاملہ پیش ہوا ہے کیا تم میں سے کسی کو اس طرح کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی فیصلہ معلوم ہے؟ چنانچہ ایسا ہوتا کہ آپ کے گرد لوگ جمع ہوتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس بارے میں کوئی فیصلہ بیان کر دیتے۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے اللہ کا شکر ہے جس نے ایسے آدمی ہمارے اندر پیدا کئے جو ہمارے نبی کے ارشادات کو محفوظ رکھتے ہیں پس اگر کبھی یہ ممکن نہ ہوتا کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی سنّت دستیاب ہو تو سر برآوردہ اور نیک لوگوں کو جمع فرماتے ان سے مشورہ کرتے اور جب کسی رائے پر اتفاق ہو جاتا

تو اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے۔

قاضی شریحؒ سے روایت ہے کہ "حضرت عمر بن الخطابؓ نے انہیں ایک فرمان بھیجا کہ اگر تمہارے پاس کوئی معاملہ آئے اور وہ کتاب اللہ میں مذکور ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرنا۔ لوگوں کی رائے تمہیں اس راستے سے نہ ہٹا سکے اور اگر تمہارے پاس ایسا معاملہ آئے جس کا ذکر کتاب اللہ میں نہ ہو تو سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھو اور اس کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر ایسا معاملہ پیش ہو جس کا ذکر نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تو وہ بات اختیار کرو جس پر جمہور کا اتفاق ہو، اور اسی کے مطابق فیصلہ دو اور اگر ایسا معاملہ پیش آئے جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اور نہ اس سے قبل کسی نے اس بارے میں کچھ بتایا ہو تو تمہیں دو باتوں کا اختیار ہے کہ اگر چاہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو اور فوراً فیصلہ کر دو یا چاہو تو مزید غور و فکر کے لئے فیصلہ میں تاخیر سے کام لو لیکن میری رائے میں تاخیر تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں "ہم پر ایسا زمانہ بھی گزرا ہے کہ ہم فیصلہ نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے اہل تھے لیکن اب خدا کی قدرت نے ہمیں ایک مقام پر پہنچا دیا ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ تو اب جس کسی کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو تو اسے چاہیے کہ اللہ عزوجل کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر ایسا معاملہ ہو جس کی بابت کتاب اللہ یا رسول اللہ کا کوئی فیصلہ نہ ہو تو علمائے صالحین کے فیصلوں کے مطابق فیصلہ کرے اور یہ نہ کہے کہ میں (فیصلہ کرتے) ڈرتا ہوں اور یا میری رائے یہ ہے۔ اس لئے کہ حرام بھی ظاہر ہے اور حلال بھی واضح ہے البتہ کچھ چیزیں ان کے درمیان مشتبہ ہیں (جن کی حرمت و حلت واضح نہیں ہے) سو جو چیز تمہارے دل میں کھٹکے اسے چھوڑ دو اور جو ایسی نہ ہو اسے اختیار کر لو۔"

حضرت ابن عباسؓ سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اگر اس کا ذکر قرآن مجید میں ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ دے دیتے اور اگر قرآن مجید میں نہ ہوتا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں کچھ ارشاد ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے اور اگر (قرآن وسنّت میں نہ پاتے) تو حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ کے فیصلوں کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر ایسا بھی نہ ہوتا تو اپنی اجتہادی رائے کے مطابق فیصلہ دیتے۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا" کیا تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم عذاب دیئے جاؤ گے یا زمین میں دھنسا دیئے جاؤ گے اگر تم (اپنے دل سے گھڑ کر) کہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا فرمایا یا کسی اور نے ایسا کہا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مقابلے میں کسی اور کا قول پیش کرنا موجب ہلاکت ہے)۔

حضرت قتادہؒ سے مروی ہے کہ "ابن سیرینؒ نے ایک آدمی کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث سنائی تو اس آدمی نے کہا کہ اس بارے میں فلاں شخص کا یہ کہنا ہے اس پر ابن سیرینؒ نے (برہم ہو کر) کہا" میں تمہیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سناتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ فلاں شخص نے یوں اور یوں کہا ہے۔

امام اوزاعیؒ سے مروی ہے کہ عمر بن عبد العزیزؒ نے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ کتاب اللہ کے سامنے کسی کی رائے کا وزن نہیں ہے ائمہ کرام کی رائے صرف اس بارے میں قابل اعتبار ہے جہاں اللہ کی کتاب بیان نہ کر رہی ہو اور سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی اس بارے میں کچھ ارشاد نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو طریق کار ارشاد فرما دیا اس کے مقابلے میں کسی کی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

اعمشؒ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ فرماتے تھے کہ تنہا مقتدی امام کی بائیں جانب کھڑا ہو تب میں نے انہیں سمیع زیاتؒ کے حوالے سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان (ابن عباسؓ) کو تہجد میں اپنی دائیں جانب کھڑا کیا تھا۔ یہ روایت سن کر ابراہیم نخعیؒ نے اسی قول کو اختیار کرلیا۔

اور شعبیؒ سے مروی ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی کسی مسئلہ کے بارے میں ان سے دریافت کر رہا تھا تو انہوں نے کہا کہ ابن مسعودؓ اس بارے میں یوں فرمایا کرتے تھے اس نے کہا آپ اپنی رائے دیجیئے تو شعبیؒ نے کہا لوگو! تمہیں اس بات سے تعجب ہونا چاہیے کہ میں نے اس کو ابن مسعودؓ کا فتویٰ بتایا اور یہ میری رائے پوچھ رہا ہے میں ابن مسعودؓ کے جواب کو اپنی رائے سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں، اللہ کی قسم! میرے نزدیک (ابن مسعودؓ کے فتویٰ کے مقابلے میں) اپنی رائے دینے سے بہتر ہے کہ میری زبان سے گیت (یعنی گناہ کی بات) نکلے۔ ان تمام آثار کو دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

امام ترمذیؒ نے آبی سائب سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ "ہم وکیعؒ کے پاس تھے انہوں نے ایک شخص کو مخاطب کر کے کہا جو رائے سے کام لینے کا قائل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشعار کیا ہے (اشعار یہ ہے کہ قربانی کے اونٹ کے کوہان کو قربانی کا جانور ظاہر کرنے کے لیے زخمی کر دیا جائے۔ اور ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ اشعار مُثلہ (ناک، کان کاٹنے کی مانند) ہے تو اس شخص نے کہا کہ یہ قول (ابو حنیفہؒ کا نہیں بلکہ ابراہیم نخعیؒ کا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ اشعار مثلہ ہے (یعنی ناروا ہے) ابی سائب کہتے ہیں کہ "میں نے وکیعؒ کو دیکھا کہ سخت غصہ میں آ گئے اور فرمایا کہ میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات سناتا ہوں اور تو ابراہیم نخعیؒ کا قول سناتا

ہے تو اس قابل ہے کہ تجھے قید میں ڈال دیا جائے اور اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک تو اپنی اس بات سے رجوع نہ کرے۔"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عطاءؒ، حضرت مجاہدؒ اور حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنھم فرمایا کرتے تھے کہ " کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا ایسا نہیں جس کی کچھ باتیں قابل تسلیم اور کچھ باتیں قابل رد نہ ہوں۔"

غرضیکہ فقہ کو ان قواعد پر مرتب کیا گیا تو ان مسائل میں سے جن کا ذکر پہلے ہو چکا تھا یا ان کے زمانے میں واقع ہوتے کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے متعلق انہیں کوئی نہ کوئی حدیث نہ مل گئی ہو قطع نظر اس کے کہ وہ حدیث مرفوع تھی یا متصل یا مرسل یا موقوف (12) اور خواہ صحیح (13) تھی یا حسن (14) یا محض قابل اعتبار تھی یا پھر شیخین (ابو بکرؓ و عمرؓ) یا دوسرے خلفائے راشدین (عثمانؓ و علیؓ) یا شہروں کے قاضی یا کسی علاقے کے فقہاء کے آثار تھے یا انہوں نے (ان کے نہ ملنے پر) کتاب وسنّت کے عموم یا اشارات یا مقتضیات سے خود استنباط کر لیا تھا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس طرح ان کے لیے اتباعِ سنّت میں آسانی کر دی اور ان اصحاب میں سب سے عظیم الشان سب سے زیادہ احادیث کی روایت کرنے اور احادیث کی حیثیت پہچاننے والے اور فقیہانہ بصیرت رکھنے والے امام احمد بن محمد بن حنبلؒ ہیں۔ ان کے بعد اسحاق بن راھویہ ہیں اور اس طور پر فقہ کی ترتیب اس بات پر موقوف ہے کہ احادیث و آثار کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو چنانچہ احمد بن محمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ کیا فتویٰ دینے کے لئے یہ کافی ہے کہ آدمی کو ایک لاکھ احادیث یاد ہوں۔ فرمایا "نہیں" پوچھنے والا تعداد بڑھاتا رہا یہاں تک کہ جب اس نے کہا کہ فتویٰ دینے کے لیے یہ کافی ہے کہ پانچ لاکھ احادیث یاد ہوں تو امام احمد بن محمد بن حنبلؒ نے فرمایا "اب میں توقع کرتا ہوں کہ وہ بالکل فتویٰ دے سکے گا" اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ صلاحیتِ فتویٰ کی بنیاد یہ ہے (کہ اتنی زیادہ

احادیث کا علم ہو)۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اور گروہ اٹھایا اس گروہ نے دیکھا کہ اسلاف نے انہیں احادیث کے جمع کرنے کی زحمت اور (مذکورہ بالا اصول پر) فقہ ترتیب دینے سے بے نیاز کر دیا ہے تو انہیں حدیث سے متعلق دیگر فنون کے حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا مثلاً تحقیق کر کے ایسی احادیث کا انتخاب کرنا جن کی صحت پر یزید بن ہارونؒ، یحیٰ بن سعید القطانؒ، احمد، اسحاقؒ وغیرھم اکابر محدثین کا اتفاق ہو یا ان احادیث کو جمع کرنا جن پر مختلف علاقوں اور شہروں کے فقہاء و علماء نے اپنے اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے نیز ہر حدیث کے متعلق یہ طے کرنا کہ وہ کس پایہ کی ہے یا مثلاً ایسی شاذ (15) حدیثوں کے متعلق فیصلہ کرنا جن کو پہلے بیان نہیں کیا گیا یا احادیث غریب (16) (جن کے اسناد معلوم نہ ہوں) یا ان کے اسناد کو تلاش کرنا جن کے واسطے سے سابقہ جامعین احادیث نے حدیثیں نہ پائی ہوں لیکن اس میں کوئی فنی اہمیت موجود ہو کہ اس کی اسناد متصل ہوں یا اونچے درجہ کی ہوں اور یا اسے فقیہ نے فقیہ سے یا حافظ حدیث سے روایت کیا ہو۔ اس طرح کے اور دیگر علمی مقاصد اس میں شامل ہیں۔

اس گروہ میں امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابو داؤد، عبد بن حمیدؒ، دارمی، ابن ماجہ، ابو یعلیؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، دار قطنیؒ، حاکمؒ، بیہقیؒ، خطیبؒ، دیلمیؒ، ابن عبد البرؒ اور ایسے ہی دیگر اہل علم داخل ہیں۔

(شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ) میرے نزدیک علمی وسعت، نفع بخش تصنیفات اور شہرت یافتہ ہونے کے اعتبار سے چار شخصیتیں جو تقریباً ہم عہد ہیں، اہمیت کی حامل ہیں اور ان میں سب سے اول درجہ پر ابو عبداللہ البخاریؒ ہیں۔ احادیث کے بارے میں ان کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ جو حدیثیں صحیح، مشہور (17) اور متصل

ہوں ان کو دوسری احادیث سے چھانٹ کر الگ کر لیا جائے اور ان ہی سے فقہ، سیرت اور تفسیر کا استنباط کیا جائے چنانچہ اسی زاویہ نگاہ سے انہوں نے اپنی کتاب "الجامع الصحیح (18) تصنیف کی اور اس میں ان ہی خصوصیات کو ملحوظ رکھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک نیک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے ہیں " تجھے کیا ہو گیا کہ میری کتاب کو چھوڑ کر محمد بن ادریسؒ (امام شافعیؒ) کی فقہ میں مشغول ہو گیا۔ اس نے کہا" یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کی کونسی کتاب ہے؟ فرمایا! صحیح البخاری۔ اور اپنی زندگی کی قسم، اس کتاب کو جو شہرت ومقبولیت کا درجہ حاصل ہوا اس سے زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی۔

دوسرے بزرگ مسلم نیشاپوریؒ ہیں ان کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ ایسی متصل اور مرفوع حدیثوں کا انتخاب کیا جائے جن پر تمام محدثین کا اتفاق ہو اور جن سے سنّت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعین کیا جاسکے۔ وہ چاہتے تھے کہ احادیث کو اس انداز سے مرتب کیا جائے جو عوام کے ذہن میں اتر جائے اور مسائل کے اخذ کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ انہوں نے بہترین طریقہ سے (احادیث کو) مرتب کیا یعنی ہر حدیث کی تمام اسناد ایک ہی جگہ جمع کر دیں تا کہ ایک حدیث کے متن کا باہمی اختلاف واضح ہو جائے اور اس طرح مختلف سلسلہ اسانید سے (آئندہ کی) راہ عمل واضح ہو گئی اور احادیث میں باہم تطبیق دی جاسکی اور کسی ایسے شخص کے لیے جو عربی زبان سے واقفیت رکھتا ہو طریق سنّت کو چھوڑ کر کسی اور طرف جانے کا عذر باقی نہ رہا۔

تیسرے بزرگ ابو داؤد سجستانیؒ ہیں جن کے سامنے یہ مقصد تھا کہ ان احادیث کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے جن سے فقہاء استدلال کرتے ہیں اور جو ان کے ہاں مشہور ہیں اور جن پر مختلف شہروں کے علماء نے احکام کی بنیاد رکھی ہے پس انہوں

نے کتاب "سنن ابی داؤد" تالیف کی اور اس میں صحیح اور حسن احادیث کے ساتھ ساتھ ایسی احادیث بھی جمع کیں جو کمزور ہونے کے باوصف قابل عمل تھیں۔ امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ "میری کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جس کے ترک کر دینے پر سب کا اتفاق ہو اور اس میں کوئی ایسی ضعیف (19) حدیث نہیں جس کے ضعف کی تصریح نہ کر دی گئی ہو اور جن احادیث میں کوئی علّت مرکوز تھی اس کو اس انداز سے بیان کیا کہ فن حدیث میں تعّمق رکھنے والا اسے بھانپ لے۔ نیز ہر وہ حدیث جس سے کسی عالم نے کوئی مسئلہ استنباط کیا ہو جو کسی نہ کسی کا مسلک ہو۔ اسی لئے امام غزالیؒ نے کہا ہے کہ ان کی کتاب مجتہد کے لئے کافی ہے۔

چوتھے بزرگ ابوعیسیٰ الترمذی ہیں جن کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو انہوں نے واضح اور مبہم روایتوں کے بیان کرنے میں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا طریقہ اپنایا، دوسری طرف جملہ اہل مسالک کے مسلکوں کو جمع کرنے میں امام ابو داؤد کے طریقے کو اختیار کیا اور دونوں طریقوں کو یکجا کر دیا۔ صحابہؓ، تابعینؒ اور فقہائے امصار کے مسالک علیحدہ بیان کر دیئے، اس طرح انہوں نے ایک ایسی کتاب تصنیف کی جس میں نہایت خوبی کے ساتھ حدیث کی مختلف اسناد کا بڑی خوبی سے اختصار کیا کہ ایک سند تو بیان کر دی باقی اسناد کی طرف اشارہ کر دیا اور ہر حدیث کی حیثیت بیان کر دی کہ وہ صحیح ہے یا حسن یا ضعیف یا منکر (20) اور ضعیف روایتوں کے سبب ضعف کی وضاحت بھی کر دی تاکہ طالب میں یہ صلاحیت ہو جائے کہ وہ احادیث کی حیثیت جان لی اور معتبر وغیر معتبر احادیث میں امتیاز کر سکے اور یہ بھی کہ فلاں حدیث مشہور ہے یا غریب اور صحابہؓ وفقہائے امصار کے مسلکوں کو بیان کر دیا اور حسب ضرورت کسی کا نام لیا کسی کی کنیت بتا دی۔ غرضیکہ طالبان علم کے لیے کوئی امر مخفی نہیں چھوڑا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب مجتہد کے لئے کافی اور مقلد کے لئے وسیلہ بے

نیازی ہے۔

ان (علمائے حدیث) کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ ہے جن کا تعلق امام مالکؒ، امام سفیان ثوریؒ اور ان کے بعد والوں کے زمانہ سے ہے۔ یہ اصحاب نہ تخریج مسائل کو بُرا سمجھتے تھے اور نہ فتویٰ دینے والوں سے بیزار تھے۔ وہ کہتے تھے کہ فقہ پر ہی دین کی بنیاد ہے۔ اس لئے فقہ کی اشاعت ہونی چاہیے اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روایت کرنے اور اسے آپ کی طرف منسوب کرنے سے ڈرتے تھے یہاں تک کہ شعبیؒ نے کہا کہ کسی حدیث (کے سلسلہ روایات) کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد والوں تک ہی لے جانا ہمیں زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا جائے اور ابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں کہ "مجھ کو یہ زیادہ پسند ہے کہ میں کہوں کہ عبداللہ نے یہ کہا اور طلحہؓ نے یہ کہا ہے (بہ نسبت اس کے کہ یوں کہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کہا)۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث روایت کرتے تو ان کا چہرہ فق ہو جاتا (کہ مبادا کوئی غلط بات منسوب کر دی ہو) اور سہم کر فرماتے کہ حضورؐ نے یہ یا ایسا ہی کچھ فرمایا۔

حضرت عمرؓ نے جب انصار کا ایک وفد کوفہ بھیجا تو اسے ہدایت کی کہ "تم کوفہ جا رہے ہو جہاں تم ایسے (نیک) لوگوں سے ملو گے جنہیں قرآن پڑھ کر رقت آ جاتی ہے۔ تمہارے جانے پر وہ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابی آئے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابی آئے اور تم سے حدیثیں پوچھیں گے تم حتی الوسع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حوالہ کم سے کم دینا۔

ابن عونؒ کہتے ہیں کہ امام شعبیؒ کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا تو اس کا جواب دینے سے گریز کرتے۔ ابراہیم نخعیؒ برابر یہی کہتے جاتے تھے کہ ان روایات کو امام

دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

(اس احتیاط کی وجہ سے) حدیث اور فقہی مسائل کی تدوین ایک اور طرح سے معرض وجود میں آئی وہ یہ تھی کہ ان کے پاس احادیث و آثار کا وہ ذخیرہ نہ تھا کہ وہ اہل الحدیث کے اختیار کیئے ہوئے اصولوں پر مسائل فقہ کا استنباط کر سکتے اور وہ اس بات پر آمادہ نہ ہو سکے کہ علمائے شہر کے اقوال کو گہری نظر سے دیکھتے۔ ان کو جمع کرتے، ان پر نکتہ چینی کرتے اور اپنے اوپر الزام لیتے۔ ان کے نزدیک تحقیق مسائل کے بارے میں ان کے اماموں کا درجہ سب سے اونچا تھا اور ہر شے سے زیادہ رجحان انہیں اپنے اماموں کی طرف سے تھا جیسا کہ علقمہؒ نے کہا" کیا تم میں سے کوئی عبداللہ بن مسعودؓ سے زیادہ پختہ نظر رکھتا ہے؟ اور امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ "ابراہیم نخعیؒ فقہ میں سالمؒ سے بڑھ کر ہیں اگر صحبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت پیش نظر نہ ہوتی تو میں کہتا کہ "علقمہ" (تابعی) ابن عمرؓ (صحابی) سے بڑے فقیہ ہیں۔

ان اصحاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ذہانت اور زود فہمی عطا ہوئی تھی اور ان کا ذہن ایک بات سے دوسری بات کی طرف بسرعت منتقل ہونے کا اتنا ملکہ رکھتا تھا کہ وہ بہ آسانی اپنے ائمہ کے اقوال سے مسائل کا جواب اخذ کر لیتے تھے اور ہر شخص جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کے لئے اس کام کی راہ بھی آسان کر دی جاتی ہے ہر گروہ اپنی معلومات پر مطمئن ہے۔

(ہر کسے را بہر کارے ساختند)

غرض انہوں نے تخریج مسائل کا اپنا یہ اصول بنالیا کہ آدمی اس صاحب علم کی تصنیف کو یاد کر لے جو اس کے شیوخ کی بہترین ترجمانی کرنے والی ہو، ان کے اقوال سے سب سے زیادہ واقفیت رکھنے والا اور ان کے مختلف اقوال کو ترجیح دینے میں سب سے زیادہ فکر صحیح رکھنے والا ہو پھر ہر مسئلہ میں حکم کی مصلحت پر غور کرے اور جب

کوئی بات اس سے پوچھی جائے یا خود اسے جاننا ضروری ہو تو اپنے شیوخ کے اقوال کے ذخیرہ سے جو اس نے اپنے حافظہ میں محفوظ کر رکھا ہے، نظر ڈالے۔ اگر اس سے مسئلہ کا جواب مل جائے تو فبہا ورنہ ان کے کلام کی عمومیت پر غور کرے اور اسے مسئلہ کی اس صورت پر منطبق کرے یا ان کے کلام کے ضمنی اشارات پر نظر کر کے مسئلہ کا جواب اخذ کرے۔

بعض اوقات کسی مسئلہ کی تصریح (جو اس کے اپنے شیوخ کے کلام میں ہوتی ہے) (پیش نظر) مسئلہ کی تصریح میں مسئلہ کی نظیر مل جاتی ہے اور بعض اوقات کسی حکم صریح کی علّت کا سراغ بذریعہ تخریج (اخذ حکام) یا یسر (21) (مماثلت) اور حذف (درگزر) سے ہوتا ہے اور (اشتراک علت کو دیکھتے ہوئے) پیش نظر مسئلہ پر بھی جس کی تصریح نہیں ہوتی، عائد کر دیتے ہیں اور بعض اوقات کسی مسئلہ کے دو پہلو ہوتے ہیں اگر ان دونوں کو (منطقی طرز استدلال کے مطابق) قیاس اقترانی (22) یا قیاس شرطی (23) کے طور پر ترتیب دیں تو اس طرح بھی جو نتیجہ نکلے گا وہی اس مسئلہ کا جواب ہو جائے گا۔ (تاہم یاد رہے کہ فقہاء کا استخراج نتائج منطقی قیاسات پر مبنی نہیں ہوتا)۔

کبھی اخذ نتائج میں یہ ہوتا ہے کہ ان (شیوخ) کے فرمودات میں کوئی بات مثال یا اصل مسئلہ کی ایک قسم کے طور پر ہوتی ہے لیکن تعریف کے لحاظ سے جامع مانع نہیں ہوتی بلکہ غیر واضح ہوتی ہے تو اس صورت میں اہل زبان کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور اس کی ذاتیات (24) (خصوصیات) حاصل کرنے کے لیے اس کی جامع مانع تعریف کا تعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح اس کے مبہم پہلوؤں کو واضح اور مشکل پہلوؤں کو ممیّز کرتے ہیں۔

اور کبھی شیوخ کے قول میں دو صورتوں کا احتمال ہوتا ہے تو فقہاء دو متحمل صورتوں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لئے غور و فکر کرتے ہیں۔

کبھی دلائل ومسائل میں جو تعلق ہوتا ہے اس پر پردہ پڑا ہوتا ہے تو یہ اس کی توضیح کرتے ہیں۔

کبھی اخذِ مسائل ۔ آئمہ کے اقوال کے علاوہ کسی عمل یا سکوت سے بھی کیا جاتا ہے وغیرہ۔

یہ ہیں وہ طریقے جنہیں تخریج (اخذ مسائل) کہتے ہیں اور جو مسئلہ اس طرح مستنبط کیا جاتا ہے اس کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ فلاں شخص کا تخریج ہے۔ یا بقول فلاں امام کے یا فلاں امام کی قائم کردہ بنیاد کے لحاظ سے یا فلاں کے قول کے مطابق مسئلہ کا جواب یہ ہے اور جو لوگ تخریج کرتے ہیں، انہیں مجتہد فی المذہب کہا جاتا ہے۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ جس نے مبسوط یاد کر لی وہ مجتہد ہے اس سے مراد یہی اجتہاد ہے جس کی بنیاد اسی قاعدہ تخریج پر ہو۔ اگرچہ وہ علم روایت سے بے بہرہ ہو اور ایک حدیث سے بھی واقف نہ ہو۔

یہ تخریج ہر مسلک میں ہوئی اور بہت ہوئی اب جس مسلک کے اہل علم مشہور ہوئے قضاء وافتاء کے مناصب ان کے سپرد ہوئے اور ان کی تصانیف عوام میں پھیل گئیں، وہی کتابیں پڑھی گئیں اور اطراف عالم میں پھیل گئیں اور ہر طرف برابر پھیلتی رہیں اور پھیلتی جارہی ہیں اس کے برعکس جس مذہب کے علمبردار گمنامی میں رہے نہ تو انہیں قاضی ومفتی بنایا گیا اور نہ عوام نے ان سے کسی وابستگی کا اظہار کیا چنانچہ وہ مسلک کچھ عرصہ بعد ناپید ہو گیا۔

واضح ہو کہ فقہاء کے کلام سے کسی مسئلہ کی تخریج اور اس کے لیے عبارت حدیث کا تتبع دین کی اصل بنیاد ہے اور ہر زمانے میں محققین ان طریقوں کو اختیار کرتے رہے۔ ان میں سے بعض ایک طریق کو کم اور دوسرے کو زیادہ اور بعض ایک کو

زیادہ اور دوسرے کو کم اختیار کرتے تھے (یعنی فرق صرف تناسب میں ہوتا تھا) یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ان دو طریقوں میں سے کسی ایک کو بالکل چھوڑ دیا جائے جیسا کہ دونوں فریق (اہل حدیث و اہل فقہ) کے لوگ کرتے ہیں۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کو دوسرے سے ہم آہنگ کیا جائے اور ایک کی کمی کو دوسرے سے پورا کیا جائے۔ حسن بصریؒ کا قول ہے "اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تمہارا طریق کار صحیح وہ ہے جو دونوں کے بین بین ہے پس جو اہل حدیث ہے اسے چاہیے کہ جس مسلک کو اس نے اختیار کیا اور اپنا مذہب بنالیا ہے وہ اسے تابعین اور ان کے بعد والوں میں جو مجتہدین تھے، کی آراء سے موازنہ کرے۔ اور جو اہل تخریج میں سے ہے اسے چاہیے کہ وہ طریق سنّت کے معاملے میں اپنے اندر اتنی صلاحیت پیدا کرے کہ کسی صریح اور ثابت شدہ حدیث کی مخالفت سے بچ رہے اور جس مسئلہ میں حدیث یا اثر (روایت) موجود ہے اس کے بارے میں حتی الوسع اپنی رائے استعمال نہ کرے۔ اسی طرح کسی محدث کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ان قواعد کے استعمال میں جن کو ائمہ حدیث نے وضع کیا ہے اور جس پر شارع (25) کی کوئی نص (صراحت) موجود نہیں ہے، اس کے مقابلہ میں کسی حدیث کو ترک کردے یا کسی قیاسِ صحیح کو ٹھکرادے مثلاً ہر ایسی حدیث کا انکار کردینا جس کے مرسل یا منقطع ہونے کا معمولی سا شائبہ ہو جیسا کہ ابن حزمؒ نے امام بخاریؒ کی روایت کردہ (تحریم معارف) (26) (نغمہ وساز) والی حدیث کو رد کردیا ہے صرف اس بنا پر کہ اس کی سند کے منقطع ہونے کا امکان ہے حالانکہ یہ حدیث فی الواقع متصل اور صحیح ہے۔

اس قسم کے شکوک کو اس وقت اہمیت دی جاتی ہے جبکہ دو حدیثوں میں تعارض ہو۔ اسی طرح محدّثین کا یہ کہنا (محل نظر ہے) کہ فلاں شخص کو سب سے زیادہ

احادیث یاد ہیں اس وجہ سے وہ اس کی روایت کردہ احادیث کو دوسروں کی احادیث پر ترجیح دیتے ہیں قطع نظر اس کے کہ دوسرے راوی میں ترجیح کی ہزاروں وجوہ پائی جائیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ روایت بالمعنی (27) کرتے۔ عام راویات حدیث کی نظر مدّ عائے حدیث پر رہتی ہے ان امور کی طرف توجہ نہیں رہتی جنہیں صرف عربی زبان کے ماہرین ہی جانتے ہیں مثلاً فا اور واؤ جیسے حروف سے یا الفاظ کی تقدیم وتاخیر کی بناء پر استدلال کرنا اور اسی طرح کی دوسری باتیں غور وفکر کی آئینہ دار ہیں۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی دوسرا راوی اسی واقعہ (روایت) کو بیان کرتا ہے تو ایک لفظ کو چھوڑ کر دوسرا لفظ استعمال کرتا ہے۔

تقاضائے انصاف یہ ہے کہ راوی جو کچھ بیان کرتا ہے اس کے متعلق یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ہاں اگر کوئی حدیث یا کوئی اور دلیل اس پر غالب آجائے تو اسی طرف رجوع کر لینا چاہیے۔

اسی طرح کسی اہل تخریج (اخذ مسائل کرنے والے) کے لئے مناسب نہیں کہ وہ کوئی ایسی بات نکالے جو نفس کلام کی روح کے منافی ہو اور اہل لغت واہل زبان اس کا وہ مطلب نہ سمجھتے ہوں اور مطلب اخذ کردہ کی بنیاد جس امر مشترک پر ہو یا جس نظیر پر مبنی ہو اس کے بارے میں ارباب نظر اختلاف رکھتے ہوں اور ان کی رائیں باہم متصادم ہوں کہ ان سے اگر پوچھا جاتا تو اس مسئلہ کو اس مثال پر منطبق نہ کرتے یا اپنے قول کی ایسی علت بتاتے جو ان کی علت تخریج کے علاوہ ہو۔

دراصل تخریج (یا اخذ مطلب) کو صرف اس وجہ سے جائز رکھا گیا ہے کہ یہ بھی مجتہد کی تقلید ہے اور یہ اس صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جبکہ مجتہد کا کلام صحیح طور پر سمجھا جائے اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں کہ محض اس بناء پر کہ مجتہد اور اس کے ساتھیوں نے

استخراج مسائل کا ایک قاعدہ بنالیا ہے، ایسی حدیث یا اثر کو رد کر دیا جائے جسے قوم نے تسلیم کرلیا ہو۔ جیسا کہ حدیث سمراۃ (28) کو نظر انداز کر دیا گیا یا جس طرح اموال غنیمت میں رسولؐ کے) ذی القربیٰ کا حصہ (قیاس کی بناء پر) ساقط کر دیا گیا۔

غرض خود ساختہ اصول کے مقابلہ میں حدیث کو پیش نظر رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ امام شافعیؒ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں نے جو رائے بھی دی ہو یا جو اصول بھی بتایا ہو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی ارشاد اس کے خلاف مل جائے تو قابل عمل ارشاد وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" ہمارے اس خیال کی تائید میں امام ابوسلیمان الخطابیؒ کا وہ قول بھی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "معالم السنن" میں لکھا ہے کہ "میں نے اپنے زمانے میں ارباب علم کو دیکھا ہے کہ ان کے دو گروہ ہو گئے اور وہ دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، ایک اصحاب حدیث واثر دوسرا اہل فقہ ونظر۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی احتیاج میں دوسرے سے بے نیاز نہیں رہ سکتا اور نہ اپنے مقصد ومدّعا کو حاصل کرنے میں دوسرے سے بے پرواہو سکتا ہے کیونکہ حدیث کی حیثیت ایک بنیاد کی سی ہے اور فقہ مثل عمارت کے ہے جو جڑ کی شاخ کے مانند ہے اور کوئی عمارت جس کی بنیاد نہ ہو وہ ناپائیدار ہے اور محض بنیاد کا ہونا جس کے اوپر کوئی عمارت نہ ہو وہ اجاڑ میدان ہے۔

مؤلف کتاب فرماتے ہیں کہ "میں نے ان دونوں فرقوں کو دیکھا ہے کہ باوجود اس کے کہ دونوں کے مؤقف قریب قریب ہیں اور دونوں کی منزلیں بھی یکساں ہیں اور ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے اور دونوں ناگزیر طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں پھر بھی وہ ایسے بھائی ہیں جو ایک دوسرے سے جُدا ہیں کہ راہِ حق میں باہمی تعاون سے محروم ہیں۔

جہاں تک اس طبقے کا تعلق ہے جو اہل حدیث واثر ہے ان میں اکثر کی

کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ روایات نقل کریں، اسناد حدیث جمع کریں اور ایسی غریب و شاذ حدیثیں بھی تلاش کریں جن میں اکثر موضوع (29) یا مقلوب (30) (غیر مرتب) ہیں۔ یہ لوگ نہ تو احادیث کے متن کا لحاظ کرتے ہیں نہ ان کے معانی پر غور کرتے ہیں نہ ان میں جو اسرار ہوتے ہیں ان تک پہنچتے ہیں نہ ان کی تہہ پاتے ہیں اور نہ فقہ (سوجھ بوجھ) سے کام لیتے ہیں۔ یہ اصحاب بسا اوقات فقہاء پر عیب لگاتے ہیں انہیں مطعون کرتے اور ان پر سنّت کی مخالفت کا الزام لگاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ فقہاء کو جو علم کی دولت بخشی گئی ہے وہ خود اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان کو بُرا کہہ کر وہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

رہا دوسرا طبقہ یعنی اہل فقہ و نظر جن میں سے چند کے سوا بیشتر حدیث کی برتری کو نہیں پہنچتے، حدیث صحیح و ضعیف میں امتیاز نہیں کرتے اور نہ کھری کھوٹی روایات کو پہچانتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی ایسی حدیث مل بھی جائے جو ان کے اختیار کردہ مسلک اور ان کی اپنائی ہوئی آراء کے موافق ہو پھر بھی وہ اس سے تو اپنے مخالف کے خلاف دلیل قائم نہیں کرتے البتہ انہوں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ضعیف روایات اور منقطع احادیث کو بھی اگر وہ ان کے ائمہ میں مشہور ہو اور زبانوں پر اس کا چرچا ہو تو قبول کرلیں گے خواہ وہ صحت اور یقینی علم کی حامل نہ ہو۔ ان کی یہ لغزش بے خبری کے باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ان کو عمل خیر کی توفیق دے۔ جب ان کے سامنے ان کے مسلک کے کسی بڑے آدمی اور ان کے مکتبہ خیال کے کسی ممتاز شخص کا اجتہادی قول بیان کیا جاتا ہے تب اس کو قبول کرلینے کے لئے ضرور دیکھتے ہیں کہ اس قول کے راویوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد راوی کون ہے تاکہ بری الذمّہ ہو جائیں۔

چنانچہ اصحاب امام مالکؒ تو اپنے مسلک کے بارے میں صرف ان ہی اقوال کو معتبر جانتے ہیں جو ابن القاسمؒ، الاشہبؒ اور ان کے ہم پلہ دیگر مالکی علمائے

عظام سے مروی ہوں اگر عبداللہ بن عبدالحکیمؒ اور ان جیسے دیگر علماء کے ذریعہ کوئی چیز مروی ہوتو اسے آگے نہیں بڑھاتے۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے پیرو اپنے امام کے صرف وہی اقوال قبول کرتے ہیں جو امام صاحب کے تلامذہ میں سے ابو یوسفؒ، محمد بن الحسنؒ اور ان جیسے بلند مرتبہ علماء سے منقول ہوں۔ اگر کوئی قول حسن بن زیادہ اللولوی یا ان سے کم درجہ کے اصحاب سے ان کے مسلک کے خلاف جاتے ہوں تو قبول نہیں کرتے اور نہ اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ اصحاب امام شافعیؒ ان اقوال کو تسلیم کرتے ہیں۔ جو المزنی اور ربیع بن سلیمان المرادی سے مروی ہوں اور اگر حرملہ بختری اور ان جیسے اشخاص روایت کریں تو اس کی طرف التفات اور ان کے اقوال پر بھروسہ نہیں کرتے۔

الغرض اپنے ائمہ اور ان کے مذاہب کے احکام کے بارے میں ہر فقہ کے ارباب علم کا یہی دستور ہے پھر دیکھئے اگر ان جزئیات میں اور ان ائمہ کے اقوال کی روایتوں میں ان کا یہ عالم ہے کہ ان کو قبول کرنے کے لیے ان کی صحت کا پختہ اور قابل اعتماد ہونا ضروری خیال کرتے ہیں تو ان کے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ سب سے اہم اور عظیم ترین ہدایات کے بارے میں تساہل برتیں۔ اور اس (ذات پاکؐ) کے ارشادات کے نقل و بیان کو (بلا تحقیق) ایک دوسرے پر ڈالتے رہیں جو تمام اماموں کا امام اور اللہ رب العزّت کا رسول ہے جس کے حکم کی تعمیل فرض اور جس کی اطاعت بایں طور لازم ہے کہ اس کے ارشاد کے آگے دل تنگی محسوس نہ کریں اور نہ اپنے سینوں میں ایسے امور کے بارے میں کوئی کھوٹ محسوس کریں جس کا قطعی فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا ہو اور نافذ فرمایا ہو۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص جو اپنے حق کو نظر انداز کردے اور اپنے قرض خواہوں سے فیاضی کا سلوک کرے کہ کھوٹی چیز وصول

کرے اور بے عیب چیز ادا کرے وہ شخص دوسرے کے حق میں یہی رویہ اختیار کر سکتا ہے جبکہ وہ اس کا نائب بنایا گیا ہو۔ مثلاً وہ کسی ضعیف کا والی ہو یا کسی یتیم کا وصی ہو یا کسی غیر موجود شخص کا وکیل ہو۔ کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ ایسا کرے؟ اگر ایسا کرے گا تو یہ غداری اور عہد شکنی ہوگی۔ یہ معاملہ بھی مشاہدہ یا معیار کی رُو سے اسی طرح ہے لیکن بہت سے لوگوں نے یہی طرز عمل اختیار کیا کچھ لوگوں نے اس طریق حق کو طے کرنے میں دقت محسوس کی اور اس طور پر بہرہ مند ہونے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ منزل مقصود کو جلد پالیں اس لیے انہوں نے تحصیل علم کے طریقے کو مختصر کیا اور اسے پوری طرح حاصل نہ کیا۔ چند باتوں اور اصول فقہ سے اخذ کی ہوئی کچھ چیزوں کو کافی سمجھ لیا جن کا نام انہوں نے علل (احکام کی علت) رکھ لیا اور اسی کو اپنا شعارِ علم اور مخالفین کے مقابلہ کے لیے ایک ڈھال بنایا، اس کو غور وفکر اور بحث ومباحثہ کا مرکز قرار دے لیا، اسی چکر میں پڑے رہے اور اسی کی روشنی میں غالب آنے والے کو دانائی اور بزرگی کا اہل گردانا۔ اور اسی طرح غالب آجانے والا نامور فقیہ اپنے شہر اور، اپنے علاقے کا عالی مرتبت امام بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور مخفی فریب شیطان نے یہ کیا کہ ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تمہارے پاس جو سرمایہ علم ہے وہ کم اور ناکافی ہے اور جتنا چاہیے اس سے کم ہے اس لیے علم کلام سے مدد لو اور ان علوم میں علم کلام کو بھی شامل کرو اور متکلمین کے اصولوں سے مدد لو تاکہ انسان کے لئے غور وفکر کا میدان وسیع ہو جائے۔

شیطان کا یہ حیلہ کارگر رہا اور مسلمانوں کے ایک مختصر گروہ کے علاوہ بیشتر اصحاب نے اس کی پیروی کی اب دیکھنا چاہیئے کہ شیطان انہیں ان کی اپنی راہ ہدایت سے ہٹا کر کہاں لے جا رہا ہے؟ اب اللہ ہی کی مدد درکار ہے۔

(تمام شد کلام خطابی)

حواشی

1۔حدیث غریب، جس کا راوی اپنی کسی روایت میں منفرد ہو۔

2۔جو صحابہ اور تابعین کے دور تک زیادہ مشہور نہ ہوئی ہو اور بعد میں زیادہ مشہور ہو جائے۔

3۔وہ حدیثیں جن کا مضمون ایک ہو مگر مختلف راویوں سے مروی ہوں۔

4۔جن کے راوی مختلف ہوں مگر سب ایک ہی صحابی سے روایت کر رہے ہوں۔

5۔حدیث متصل وہ حدیث ہے کہ اس کی سند میں راوی پورے مذکور ہوں۔

6۔حدیث منقطع وہ حدیث ہے کہ اس کی سند متصل نہ ہو بلکہ کہیں نہ کہیں سے سلسلہ رواۃ ٹوٹا ہو۔

7۔مرفوع وہ حدیث ہے جس میں براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول یا فعل قابل قبول ہونے کا ذکر ہو۔

8۔سنن وہ کتاب ہے جس میں احکام کی احادیث، ابواب فقہ کی ترتیب کے موافق بیان ہوں جیسے سنن ابوداؤد، سنن نسائی، ابن ماجہ۔

9۔مسند وہ کتاب ہے جس میں صحابہ کرامؓ کی ترتیب یا ترتیب حروف ہجایا تقدم وتاخر اسلامی کے لحاظ سے احادیث مذکور ہوں جیسے مسند احمد، مسند دارمی۔

10۔محدث، جو حدیث کے معانی وشرح روایۃً ودرایۃً بیان کرے۔

11۔حدیث متواتر، وہ حدیث ہے جس کے روایت کرنے والے ہر زمانے میں اس قدر کثیر ہوں کہ ان سب کے جھوٹ پر اتفاق کر لینے کو عقلِ سلیم محال سمجھے اور "خبر واحد" وہ حدیث ہے جس کے راوی اس قدر کثیر نہ ہوں۔

12۔موقوف وہ حدیث ہے جس میں صحابی کے قول یا فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

13۔صحیح وہ حدیث ہے جس کے کل راوی عادل، کامل الضبط ہوں اور اس کی سند متصل ہو۔

14۔حدیث حسن۔حدیث صحیح کے بعد دوسرا درجہ یعنی جس کے راوی میں صرف ضبط ناقص ہو، باقی سب شرائط حدیث صحیح والی موجود ہوں۔

15۔شاذ وہ حدیث ہے جس کا راوی خود ثقہ ہو مگر ایک ایسی جماعت کثیرہ کی مخالفت کرتا ہو جو اس سے زیادہ ثقہ ہیں۔

16۔غریب وہ حدیث ہے۔جس کا راوی کہیں نہ کہیں منفرد ہو۔

17۔مشہور وہ حدیث ہے۔جس کے راوی ہر زمانے میں تین سے کم نہ ہوں۔

18۔جامع وہ کتاب ہے۔جس میں تفسیر، عقائد، آداب، احکام، مناقب، سیر، فتن، علامات قیامت کے مسائل کی احادیث مندرج ہوں جیسے، جامع البخاری، جامع الترمذی۔

19۔ضعیف وہ حدیث ہے۔جس کے راوی میں حدیثِ صحیح وحسن کے شرائط نہ پائے جاتے ہوں۔

20۔منکر وہ حدیث ہے۔جس کا راوی باوجود ضعیف ہونے کے جماعت ثقات کے مخالف روایت کرے۔

21۔تخریج کی طرح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب اصل کے تمام اوصاف کو اس فرع کے سامنے جس طرح اصل پر قیاس کیا جارہا ہے، رکھ کر دیکھا جائے۔اور اس وصف کو لے کر جو اصل اور فرع میں مشترک ہے باقی سے صرف نظر کر لیا جائے تاکہ حکم کی علت متعین ہو جائے۔

22۔قیاس اقترانی، منطق کی اصطلاح میں اس قیاس (دلیل) کو کہتے ہیں جس کے مقدمات صغریٰ وکبریٰ میں نتیجہ یا اس کی نقیض بعینہ موجود نہ ہو بلکہ دلیل سے نتیجہ برآمد ہوتا ہو یعنی وہ دلیل مشتمل بر نتیجہ نہ ہو بلکہ مقترن با نتیجہ ہو۔مثلاً عالم متغیر ہے (صغریٰ) اور ہر متغیر حادث ہے، لہذا عالم حادث ہے یہ نتیجہ اس دلیل سے نکلتا ہے۔

23۔قیاس شرطی، جس کے دونوں مقدمے شرطی ہوں۔یعنی جس میں کسی چیز کے لئے کسی دوسری چیز کے ثبوت یا عدم ثبوت کا حکم لگایا گیا ہو۔اس قیاس میں نتیجہ بعینہ موجود ہوتا ہے مثلاً کوئی کہے کہ اگر جھوٹ بولے تو تم ذلیل ہو گے لیکن جھوٹ بولے ہو لہذا ذلیل ہو گے۔(یہ نتیجہ خود قیاس کے مقدمات یعنی صغریٰ و کبریٰ میں بعینہ موجود ہے) اسے شرطی اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں جملہ شرطیہ ہوتا ہے۔

24۔کسی چیز کے وہ بنیادی اوصاف جو اس کی حقیقت (کنہہ) سے تعلق رکھتے ہوں۔

25۔(صاحب شریعت) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔

26۔گانے بجانے کو حرام قرار دینا ہے۔

27۔ارشاد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مفہوم کو نقل الفاظ کی بجائے اپنے لفظوں میں ادا کرنا۔

28۔مصراۃ اس دودھ دینے والے جانور کو کہتے ہیں جس کو بیچنے کی غرض سے اس کے تھنوں سے چند وقت دودھ نہ نکالا جائے تاکہ خریدنے والے کو اس کے تھن دیکھ کر دھوکہ ہو کہ زیادہ دودھ دینے والا جانور ہے۔

حدیث مصراۃ میں یہ ہے کہ جو کوئی ایسا جانور خریدے، اسے اختیار ہے چاہے رکھے یا واپس کر دے۔ واپس کرنے کی صورت میں نکالے ہوئے دودھ کے بدلے ایک صاع کھجور دے۔

احناف نے اس حدیث پر عمل سے اس لئے انکار کیا کہ یہ حدیث خلافِ قیاس ہے۔ قیاس یہ ہے کہ نکالے ہوئے دودھ کا بدلہ اس کے برابر ہونا چاہیے لیکن حدیث میں بہر حال ایک صاع کھجور دینے کا حکم ہے۔

29۔ موضوع وہ حدیث ہے جس کے راوی پر حدیث نبویؐ میں جھوٹ بولنے کا طعن ہو۔

30۔ مقلوب وہ حدیث ہے جس میں بھول سے متن یا سند کے اندر تقدیم یا تاخیر واقع ہوگئی ہو یعنی لفظ مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کیا گیا ہو یا بھول کر ایک راوی کی جگہ دوسرا راوی رکھا گیا ہو۔

باب چہارم

حالات قبل از صدی چہارم

چوتھی صدی ہجری سے قبل کے لوگوں کے حالات اور متقدمین و متاخرین میں اختلاف کے اسباب اور کسی مسلک سے منسوب ہونے یا نہ ہونے کا بیان اور ان علماء کے مابین اختلاف کے اسباب کا ذکر جو مجتہد مطلق (عمومی اجتہاد کے قائل ہیں) اور جو مجتہد فی المذہب (مذہبی مسائل میں اجتہاد کے قائل) ہیں اور ان کا باہمی فرق

واضح رہے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لوگ ایک خاص اور معین مسلک کی تقلید پر متفق نہ تھے چنانچہ ابو طالب المکیؒ نے اپنی کتاب "قوت القلوب" میں بیان کیا ہے کہ "یہ کتب اور رسائل بعد کی چیزیں ہیں لوگوں کے اقوال بیان کرنا اور ایک خاص شخص کے فقہی مذہب پر فتویٰ دینا اور ہر بات میں اس کے قول اور روایت کو اختیار کرنا اور اس کے مسلک پر بھروسہ کرنا پہلی اور دوسری صدی میں لوگوں کا معمول نہ تھا" بلکہ اس دور میں لوگوں کے دو طبقے تھے۔ 1۔ طبقہ علماء 2۔ طبقہ عوام۔

عوام کے بہتر اشخاص کا حال یہ تھا کہ وہ متفق علیہ مسائل میں جن کے بارے میں مسلمانوں کے اندر یا جمہور مجتہدین میں کوئی اختلاف نہ تھا ان کے سلسلے میں وہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا اور کسی کی تقلید نہ کرتے تھے یہ لوگ وضو اور غسل، کے طریقے، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام اپنے باپ دادا یا اپنے علاقے کے معلمین سے سیکھتے اور اسی پر چلتے تھے جب کوئی غیر معمولی اور نیا امر پیش آتا تو جس مفتی کو پاتے بلا لحاظ مسلک اس سے فتویٰ پوچھتے۔ ابن الہمام نے اپنے رسالہ "التحریر" کے آخر میں لکھا ہے کہ "یہ لوگ کبھی ایک مفتی سے فتویٰ پوچھتے اور کبھی کسی اور مفتی سے

ایک ہی مفتی پر انحصار نہ تھا" اور جہاں تک علماء کا تعلق ہے ان کے دو طبقے تھے ایک وہ جنہوں نے کتاب وسنّت و آثار کے تتبع میں اتنی محنت وکوشش کی کہ ان کو تجربہ کی بنا پر ایسا ملکہ حاصل ہو گیا تھا کہ وہ مفتی بنیں یعنی لوگوں کو جو مسائل بیشتر پیش آتے ہیں ان میں سے اکثر کے بارے میں وہ فتویٰ دے سکیں۔ ایسے مسائل جن کے متعلق وہ فتویٰ دیتے وہ ان امور کی بنسبت زیادہ ہوتے تھے جن میں وہ اٹک جاتے تھے۔ ان اصحاب کے لئے مجتہد مطلق کا نام خاص تھا۔

یہ استعداد دو طرح سے حاصل ہوتی ہے ایک تو یہ ہے کہ ہر ممکن کوشش صرف کر کے روایات کو جمع کیا جائے کیونکہ احکام (شرعیہ) کا ایک بڑا حصہ احادیث میں اور ایک بڑا حصہ صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے آثار میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ایک عاقل اور عارف زبان دان مواقع کلام سے بے خبر نہیں ہوتا اور نہ علم روایت سے ناواقف اور نہ مختلف روایات میں مطابقت دینے کے طریقوں اور ترتیب دلائل سے بیگانہ ہوتا ہے۔ جیسے کہ قدوۃ الائمہ احمد بن محمد بن حنبلؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ تھے۔

اور کبھی یہ استعداد تخریج کے طریقوں کو پختہ طور پر ذہن نشین کر لینے اور ان اصولی قواعد وضوابط کو دماغ میں محفوظ کر لینے سے پیدا ہوتی ہے جو ہر باب کے متعلق ائمہ فقہاء سے منقول ہیں بشرطیکہ اس کے ساتھ سنن و آثار کا ذخیرہ ان کے پاس موجود ہو اس کی مثال پیشوائے ائمہ ابو یوسفؒ اور امام محمد بن حسنؒ ہیں۔

دوسرے گروہ میں وہ علماء شامل ہیں جن کو قرآن وسنن کی اتنی معرفت حاصل تھی جس سے وہ فقہ کے اصول اور اس کے بنیادی مسائل کو تفصیلی دلائل کے ساتھ جان سکتے تھے۔ بعض ایسے مسائل تھے جن میں انہیں دلائل کے ذریعے ایک واضح اور غالب رائے حاصل ہو جاتی تھی اور بعض کے متعلق وہ توقف کرتے۔ ان

(مؤخرالذکر) مسائل کے بارے میں وہ علماء سے مشورہ کرنے کے محتاج ہوتے تھے کیونکہ ان مسائل کے متعلق کسی واضح رائے تک پہنچنے کے لئے ان کے پاس وہ مسائل نہ تھے جو مجتہد مطلق کے پاس تھے۔ پس اس قسم کے علماء کو بعض مسائل میں مجتہد کی اور بعض مسائل میں غیر مجتہد کی حیثیت حاصل ہے۔

صحابہؓ وتابعینؒ سے یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جب انہیں کوئی حدیث مل جاتی تو وہ غیر مشروط طور پر اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے تھے لیکن دو صدیوں کے بعد لوگوں میں معیّن مجتہدین کے مذاہب کو اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ چنانچہ بہت کم ایسے تھے جو کسی خاص معیّن مجتہد کے مسلک کے پابند نہ ہوتے۔ اس زمانے میں یہ تقلید ایک امر واجب ہوگئی۔

اس کا سبب یہ ہے کہ فقہ سے وابستگی رکھنے والے کو دو ہی صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی تمام توجہ اس طرف مبذول رہے کہ وہ ایسے مسائل سے واقفیت حاصل کرے جن کا جواب مجتہدین تفصیلی دلائل کے ساتھ پہلے ہی دے چکے ہیں۔ ان پر تنقید کرے۔ ان کے مآخذ کی تحقیق کرے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور اس وقت تک کامیابی سے تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا جب تک اس فقیہ کو کسی ایسے امام مجتہد کی رہنمائی میسر نہ ہو جس نے فقہی مسائل کو الگ الگ شعبوں میں پھیلا کر بیان کرنے اور ان کے دلائل مہیا کرنے کی زحمتوں سے اس کو بے نیاز نہ کر دیا ہو۔ اسے چاہیئے کہ امام کی ان تصریحات سے مدد لے کر نقد و تحقیق اور ترجیح میں مشغول ہو۔ اگر کسی امام کی اقتداء اسے میسر نہ ہو تو اس کا کام بہت مشکل ہو جائے گا اور یہ بات ظاہر ہے کہ امر سہل ہوتے ہوئے مُشکل امر اختیار کرنے میں کوئی تک نہیں ہے۔ لازم ہے کہ فقہ کا یہ طالب علم اپنے امام کے بعض اقوال کو پسندیدہ سمجھ کر ان سے اتفاق کرے اور بعض کی تصحیح کرے۔ اسے لازم ہے کہ اتفاق واختلاف کا تناسب دیکھے اگر

اختلاف اتفاق سے کم ہے تو یہ فقیہ اپنے اس امام مجتہد کے مسلک کے بارے میں اصحاب (1) الوجوہ شمار کیا جائے گا اور اگر اس کے برعکس ہو تو اس وقت وہ اصحاب الوجوہ میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس کے باوصف وہ فقیہ فی الجملہ اسی امام مذہب کی طرف منسوب رہے گا اور ان لوگوں میں شمار نہ ہوگا جو کسی اور امام کے اکثر اصول وفروع میں اقتدا کر رہے ہیں اور اس قسم کے صاحب علم کے بعض اجتہادی مسائل ایسے بھی پائے جائیں گے جن کے جواب اب تک فقہی تصنیفات میں نہ آئے ہوں کیونکہ واقعات تو آتے رہیں گے اور اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے اس لئے ان مسائل کا جواب اپنے امام کی رہنمائی کا خیال چھوڑتے ہوئے براہ راست کتاب و سنّت اور آثار سلف سے اخذ کرے گا۔ لیکن اس قسم کے نئے مسائل کی تعداد ان کے مقابلہ میں جن کا کوئی نہ کوئی جواب پہلے دیا جا چکا ہے بہت کم ہوگی۔ ایسے شخص کو مجتہد مطلق منتسب کہا جاتا ہے۔

اہل فقہ کو دوسری صورت یہ پیش آسکتی ہے کہ اس کی ساری توجہ اس طرف، مرکوز ہو کہ وہ ان مسائل پر دسترس پالے جن کو فتویٰ پوچھنے والے اس سے دریافت کریں اور جن کے متعلق علمائے سلف کا کوئی قول منقول نہ ہو، ایسا فقیہ ایک ایسے امام کی اقتداء کا مذکورہ بالا فقیہ سے بھی زیادہ محتاج ہے جس کے مرتب کردہ فقہی اصولوں سے وہ فائدہ حاصل کر سکے کیونکہ فقہ کے مسائل باہم ایک دوسرے سے وابستہ ومربوط ہیں اور ان کی فروع وجزئیات کا تعلق ان کے مآخذ سے ہے۔

ایسی صورت میں اگر کوئی شخص بطور خود تمام مسالک فقہ کی جانچ پڑتال اور ان کے متعلقہ اقوال کی چھان بین از سرنو شروع کرے تو یہ بن نہ پڑے گا اور تمام عمر اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔ پس اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ جن مسائل کا جواب دیا جا چکا ہے ان ہی پر غور وفکر

کرے اوران کوسامنے رکھ کرمزید جزئیات اخذ کرے۔

ایسی صورت میں اسے کتاب وسنت، آثار سلف اور قیاس کی بنا پر اپنے امام سے اختلاف کرنا ہوگا لیکن یہ اختلاف موافقت کے مقابلہ میں بہت کم ہوگا۔ ایسا عالم مجتہد فی المذہب (یعنی ایسا فقیہ جو اپنے مسلک ہی سے جدید مسالک اخذ کرے) کہلاتا ہے۔

یہی دوصورتیں ہیں جو عملاً فقہ کے طالب علم کواس وقت پیش آ سکتی تھیں۔

ایک تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص اول تو یہ کوشش کرے کہ اس سے پہلے کون کون سے مسائل پیش آ چکے ہیں اور پھر اس میں لگ جائے کہ ان میں سے کونسا مسئلہ قابل اخذ اور اس کے نزدیک درست ہے یہ صورت غیر متوقع اور ناممکن ہے کیونکہ نزول وحی کو ایک مدت ہو چکی ہے اور وہ وقت گزر چکا جبکہ ہر عالم کو لازمی طور پر بکثرت حالات میں یہ جاننا ضروری تھا کہ کونسی حدیث کتنے طرق اور کن عبارتوں میں روایت کی گئی؟ کونسا راوی کس پایہ کا ہے؟ کونسی حدیث صحیح یا ضعیف ہے؟ اور مختلف احادیث و آثار میں مطابقت کیسے کی جائے؟ اور اس امر کی واقفیت کہ کونسی احادیث فقہ کا ماخذ ہیں اور اسی طرح غریب الفاظ کی اور فقہ کے اصولوں کی پہچان۔ ان تمام بے شمار مسائل کو پوری شرح کے ساتھ اور باہمی اختلاف کی وضاحت کے ساتھ معلوم کیا جا سکے جن کے بارے میں علمائے سلف بحث کر چکے ہیں۔ پھر ان مختلف روایات کے اندر غور و فکر کر کے راجح و مرجوح کا فیصلہ کرنا اور ان کو دلائل سے پرکھنا۔ یہ سب کام ایسے ہیں جن میں متقدمین سے استفادہ کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے اور اگر ان امور میں اپنی زندگی ختم کر ڈالیں تو مزید مسائل ضروریہ کی تفریع کیسے ممکن ہے؟ جبکہ انسانی دماغ خواہ وہ کتنا ہی ذہین ہو اس کی صلاحیتوں کی ایک حد متعین ہے جس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہاں یہ کمال علماء کو ضرور حاصل تھا جو باعتبار زمانہ بزم اجتہاد کی صف

اول میں تھے۔ کیونکہ وحی کا زمانہ گزرے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی اور علوم کی یہ گونا گونی اور فراوانی نہ تھی لیکن اس کے باوصف کمال چند نفوس سے زیادہ کو حاصل نہ ہوسکا اور وہ اس کے باوجود اپنے اساتذہ کے پیرو تھے اور ان پر اعتماد کرتے تھے لیکن چونکہ اس علم میں انہوں نے کافی تصرفات کیئے اس لئے وہ مستقل مجتہد قرار پائے۔

مختصر یہ کہ ائمہ مجتہدین کے مذہب کو اختیار کر لینا ایک قدرتی تحریک تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے علماء کے دلوں میں ڈالا اور وہ شعوری یا لاشعوری طور پر کسی ایک مسلک پر متفق ہو گئے۔ ہماری اس بات کی تائید مشہور شافعی فقیہ ابن زیاد یمنیؒ کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے وہ ایسے دو مسئلوں کے متعلق استفسار کے جواب میں جس میں بلقینیؒ نے امام شافعیؒ کے مذہب کے خلاف فتویٰ دیا ہے، کہا تھا "تم بلقینی کے کلام کی توجیہ نہیں سمجھ سکتے جب تک یہ نہ جان لو کہ ان کا علمی مقام کیا تھا کیونکہ وہ مجتہد مطلق منتسب، غیر مستقل اور صاحب تخریج وترجیح ہیں۔ مجتہد مطلق منتسب سے میری مراد وہ ہے جو اپنے اس امام کے مسلک میں جس کی طرف وہ منسوب ہے (کسی مسئلہ میں) ترجیح کا اختیار رکھتا ہو اور اس قول کی بھی مخالفت کر سکتا ہو جو راجح تسلیم کیا جاتا ہو۔ اکابر علمائے شافعیہ متقدمین ومتاخرین میں سے بھی اکثر کا یہی حال ہے جن کا تذکرہ اور ان کے درجات کی ترتیب کا بیان آگے آئے گا۔

اور جن لوگوں نے بلقینیؒ کو مجتہدین مطلق منتسب کے زمرہ میں شمار کیا ہے ان میں سے ایک ان کے شاگرد ابو زرعہؒ بھی ہیں وہ کہتے ہیں کہ "ایک بار میں نے اپنے استاد امام بلقینیؒ سے کہا کہ " کیا بات ہے کہ شیخ تقی الدین السبکیؒ اجتہاد سے کتراتے ہیں حالانکہ ان میں اجتہاد کی تمام شرائط موجود ہیں۔ آخر تقلید کیوں کرتے ہیں؟ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں مجھے اپنے شیخ امام بلقینیؒ کا نام لیتے ہوئے شرم آئی (حالانکہ یہی سوال ان کے باب میں کیا جا سکتا تھا) دراصل میں چاہتا تھا کہ اس کا

حقیقی سبب مجھے معلوم ہو جائے لیکن امام بلقینیؒ میرا یہ سوال سن کر خاموش رہے بالآخر میں خود ہی بولا کہ "میرے نزدیک اس کا باعث سرکاری فرائض ہیں جو حکومت کی طرف سے چاروں فقہی مذاہب کے مقلد علماء پر عائد ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان مذاہب کی تقلید سے نکل کر خود اجتہاد کرنے لگے تو اسے کچھ حاصل نہ ہوگا اور قضاء کے عہدوں سے محروم ہو جائے گا۔ لوگ فتویٰ پوچھنا چھوڑ دیں گے اور وہ بدعتی مشہور ہو جائے گا تو امام بلقینیؒ یہ بات سن کر مسکرائے اور میرے خیال سے موافقت کی" انتہی۔

مؤلف کتاب کا کہنا ہے کہ میں یہ نہیں جانتا کہ ان کا اونچا عہدہ اجتہاد کی راہ میں مانع تھا ان بزرگوں کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ اجتہاد کی صلاحیت مکمل رکھنے کے باوصف عہدہ قضا اور ذرائع معاش کی خاطر اجتہاد کو چھوڑ دیں ان بزرگوں کے متعلق کسی کو بھی روا نہیں ہے کہ ایسا سوءظن رکھے، یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ اس بارے میں جمہور ملت کی صحیح ترین رائے یہ ہے کہ جو شخص بھی اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس پر واجب ہے کہ اجتہاد کرے۔ ابو زرعہؒ نے ان اصحاب کے متعلق یہ نسبت کیسے کی اور امام بلقینی کا اس سے موافق ہونا کیسے ہو سکتا ہے (کہ یہ بزرگ ملازمت کے لالچ میں ایک امر واجب کو زندگی بھر ترک کر دیں) درآنحالیکہ جلال الدین سیوطیؒ شرح کتاب التنبیہ کے باب الطلاق میں لکھتے ہیں کہ "اللہ کے اقوال میں جو اختلافات (2) واقع ہوئے ہیں ان کی وجہ ان کے اجتہاد کا تغیّر ہے۔ جس موقع پر وہ جس بات کو صحیح سمجھتے وہ وہی بات ہوتی جو ان کے اجتہاد میں اس وقت صحیح معلوم ہوتی تھی۔ (3)

اس کتاب (التنبیہ) کا مصنف وہ ہے جس کے رتبہ اجتہاد کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور کتنے ہی علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ مصنف مذکور ابن الصباحؒ، امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ اجتہاد مطلق کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔

اور یہ جو فتاویٰ ابن اصلاح میں مذکور ہے کہ یہ لوگ اجتہاد فی المذہب کا مرتبہ رکھتے تھے نہ کہ اجتہاد مطلق کا، تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اجتہاد مطلق مستقل کا درجہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا مقام اجتہاد مطلق منتسب کا تھا۔ کیونکہ اجتہاد "مطلق" کی دو قسمیں ہیں ایک مطلق مستقل دوسرا مطلق منتسب۔ چنانچہ خود ابن الصلاحؒ نے اپنی کتاب "آداب الفقیأ" میں اور امام نوویؒ نے "شرح المذہب" میں اس کی وضاحت کی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کے اجتہاد (یعنی اجتہاد مستقل) کا دروازہ تو چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ہی ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا جس کا اب کوئی وجود نہیں۔ رہی دوسری قسم سو وہ اب باقی ہے اور آثار قیامت نمودار ہونے تک باقی رہے گی اس کا کوئی کسی زمانہ میں موقوف ہونا شرعاً جائز نہیں کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے یعنی اگر کسی کا کسی زمانہ کے مسلمان ایسا اجتہاد کرنے سے پہلوتہی کرنے لگیں یہاں تک کہ چھوڑ دیں تو سب کے سب گناہ گار ہوں گے جیسا کہ ہمارے علماء مثلاً الماوردیؒ نے اپنی کتاب "الحادی" میں، الرویائیؒ نے "البحر" میں اور البغویؒ نے "التہذیب" میں اور اسی طرح بہت سے علماء نے صراحت سے لکھا ہے۔ اور یاد رہے کہ یہ فرض کفایہ اجتہاد مقید سے ادا نہیں ہوسکتا جیسا کہ ابن الصلاحؒ نے اس کی تصریح کی ہے اور نوویؒ نے شرح المذہب میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

اس مسئلہ کی تشریح ہماری کتاب میں ہے جس کا نام "الردّ الی من اخلد الی الارض و جهل ان الاجتهاد فی کل عصر فرض" (یعنی یہ کتاب ان لوگوں کی تردید میں ہے جو زمین پر رہے اور اس بات سے بے خبر رہے کہ اجتہاد ہر زمانے میں فرض ہے)۔

اور یہ علماء محض اس وجہ سے کہ وہ اجتہاد مطلق منتسب کا درجہ رکھتے تھے، دائرہ شافعیت سے باہر نہیں گئے جیسا کہ نوویؒ نے اور "طبقات" میں ابن الصلاحؒ نے

تصریح کی ہے اور ابن السبکیؒ نے بھی ان کی ہمنوائی کی ہے۔ چنانچہ ان علماء نے مذہب شافعیہ کی کتابیں تصنیف کیں اور ایک شافعی فقیہ کی حیثیت سے فتوے دیئے اور شافعی مناصب پر ان کا تقرر ہوا جیسا کہ اس کتاب کے مصنف اور ابن الصباغ رحمۃ اللہ علیہ کو بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں فریضہ تدریس سونپا گیا اور امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ کو نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں اور ابن عبدالسلامؒ کو قاہرہ کے مدرسہ جابتیہ اور مدرسہ ظاہریہ میں شعبہ تعلیم کا سربراہ مقرر کیا گیا اور ابن دقیق العید کو مدرسہ صلاحیۃ میں جو ہمارے امام شافعیؒ کے مقبرہ کے قریب واقع ہے نیز مدرسہ فاضلیہ اور مدرسہ کاملیہ وغیرہ میں فرائض تعلیم سونپے گئے۔

واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص اجتہاد مستقل کے مرتبہ پر پہنچ جائے تو وہ شافعی المسلک نہ رہے گا اور نہ اس کے اقوال اس مسلک کی کتابوں میں منقول ہوں گے اور جہاں تک مجھے علم ہے اصحابِ شافعیؒ میں سے سوائے ابوجعفر ابن جریر الطبریؒ کے کوئی شخص بھی اس مقام (اجتہاد مستقل) تک نہیں پہنچا۔ ابن جریرؒ پہلے شافعی تھے پھر ایک مستقل مسلک فقہی کے امام مجتہد ہو گئے۔ اسی وجہ سے الرافعیؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ ابن جریرؒ کا تفرد (4) کسی طرح بھی مسلکِ شافعی کا پیرو ہونے کی وجہ سے نہیں تھا۔

مؤلف کتاب کا کہنا ہے کہ ان کے نزدیک (ابن جریر طبریؒ کے باب میں جس خیال کا اظہار کیا گیا یہ ان کے نزدیک) اس قول سے بہتر ہے جو ابوزرعہؒ نے کہا لیکن ان کے الفاظ اس بات کے مقتضی ہیں کہ ابن جریرؒ کو شافعی المسلک شمار نہ کیا جائے مگر یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس بارے میں الرافعیؒ نے "کتاب الزکاۃ" کے شروع میں لکھا ہے کہ "ابن جریرؒ کا تفرد ہر چند کہ ہمارے مسلک کے طریقوں میں سے کوئی طریقہ شمار نہیں ہوتا تاہم وہ خود اصحاب شافعی کے طبقات میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح نوویؒ نے اپنی کتاب "التہذیب" میں کہا ہے کہ "ابوعاصم العبادیؒ

نے ابن جریرؒ کا تذکرہ فقہائے شافعیہ کے زمرہ میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ہمارے علماء میں سے ہیں"۔ انہوں نے ربیع المرادیؒ اور حسن الزعفرانیؒ سے فقہ شافعی کا علم حاصل کیا اور انہیں مسلک شافعی سے منسوب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا طریقہ اجتہاد، ان کا اسلوب استدلال اور ان کا طرز ترتیب دلائل تقریباً وہی تھا جو امام شافعیؒ کا تھا۔ اور اگر کبھی اختلاف بھی کیا تو ایسے کہ کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکے اور امام شافعیؒ سے چند مسائل میں اختلاف کیا تو اس کو اہمیت نہیں دی۔ اور چند مسائل کے سوا ان کے طریق کار کو نہیں چھوڑا اور یہ امر ان کے مسلکِ شافعی میں رہنے کے منافی نہیں ہے۔

امام محمد بن اسماعیل البخاریؒ کا فقہی مقام بھی ایسا ہی ہے۔ ان کا شمار بھی طبقاتِ شافعیہ میں ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں سے جنہوں نے ان کو طبقات شافعیہ میں شمار کیا ہے، شیخ تاج الدین السبکی بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "امام بخاریؒ نے علم فقہ حمیدیؒ سے اور حمیدیؒ نے امام شافعیؒ سے حاصل کیا" اور ہمارے استاد علام نے بھی امام بخاریؒ کے شافعی ہونے پر یہی دلیل دی ہے کہ تاج الدین السبکیؒ نے ان کا تذکرہ طبقاتِ شافعیہ میں ان ہی کے زمرہ میں کیا ہے۔ نوویؒ کا کلام جو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ بھی اسی کا مؤید ہے۔

شیخ تاج الدین السبکیؒ اپنی کتاب "طبقات" میں یوں ذکر کرتے ہیں کہ "ہر امر مخزج (مسئلہ تخریج شدہ) جس کی تخریج بطریق اجتہاد مطلق ہوئی ہو اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ صاحب تخریج کن لوگوں میں سے ہے؟ اگر وہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر عموماً کوئی مسلک اور اس کی تقلید غالب رہتی ہے مثلاً ابو حامد الغزالیؒ، شیخ قفالؒ تو ان کا شمار اسی مسلک میں ہوگا اور اگر وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اکثر حالات میں کسی مسلک سے باہر نکل جاتے ہیں۔ جیسے وہ اصحاب جن کے نام محمد سے شروع

ہوتے ہیں یعنی محمد بن اربعہؒ، محمد بن جریرؒ، محمد بن خزیمہؒ، محمد بن نصر المروزیؒ اور محمد بن المنذرؒ تو وہ اسی مسلک کے پیروؤں میں شمار ہوں گے۔ رہے المزنیؒ اور ان کے بعد ابن سریج رحمۃ اللہ علیہ تو ان کا مقام بین بین سا ہے نہ تو مذکورہ بالا چاروں حضرات کی طرح مذہب شافعی سے باہر ہی رہتے ہیں اور نہ ہی عراقیوں اور خراسانیوں کی طرح مجتہدین مطلق میں شمار ہوتے ہیں۔ (منتہی)

سبکیؒ اپنی کتاب "طبقات" میں شیخ ابو الحسن الاشعریؒ امام اہل سنّت والجماعت کا یوں تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ اصحاب شافعیہ میں شمار کیے جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے علم فقہ شیخ ابو اسحاق المروزی سے حاصل کیا۔ ختم شد قول ابن زیاد۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی تائید " کتاب الانوار" سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا مصنف کہتا ہے کہ "جو لوگ امام شافعیؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ یا امام احمدؒ کے مسلک کی طرف منسوب ہیں ان کی چند قسمیں ہیں۔

1۔ طبقہ عوام۔ جن کا امام مشافعیؒ کی تقلید کرنا ان مجتہدین کے توسّط سے ہوتا ہے (جو امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہوتے ہیں)۔

2۔ وہ لوگ جو درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوتے ہیں اگر چہ وہ شخص جو درجہ اجتہاد کو پہنچا ہوا ہو وہ کسی مجتہد کی تقلید نہیں کرتا مگر اس کے باوصف وہ ایک امام کیطرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ وہ اجتہاد کے طریقے، ادلۃ کے استعمال اور ان کی باہمی ترتیب کا وہی انداز اختیار کرتا ہے جو اس امام کا طریقہ ہوتا ہے۔

3۔ طبقہ متوسطین۔ وہ لوگ جو درجہ اجتہاد کو نہیں پہنچے لیکن اجتہاد کے وہ اصول ان کے سامنے ہوتے ہیں اور وہ اس بات کی قدرت رکھتے ہیں کہ جو مسئلہ (امام کے اقوال مین) تصریح کے ساتھ نہیں آیا اس کو امام کے واضح کردہ اقوال پر قیاس کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ بھی امام کے مقلد ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ وہ عالم

لوگ بھی جو ان کے مستنبط اقوال کو اختیار کرتے ہیں۔ تاہم ان اصحاب کو یہ حیثیت حاصل نہیں کہ ان کی تقلید کی جائے کیونکہ وہ خود دوسرے کے مقلد ہیں۔ ختم شد کلام الانوار۔

(ان دلائل کی روشنی میں کہ ابتدائی دو صدیوں میں کسی معیّن فقہی مذہب کو اختیار کرنے کا دستور نہ تھا اور تیسری صدی میں کسی نہ کسی معین فقہی مذہب کو اختیار کرنا عام ہو گیا اور یہ چیز ایک امر واجب قرار پائی، کہا جا سکتا ہے کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک وقت میں کوئی چیز واجب نہ ہو اور دوسرے وقت وہی چیز واجب ہو جائے در آنحالیکہ شریعت ایک ہی ہے؟

یہ اعتراض مجتہد مستقل کی اقتدا پہلے واجب نہ تھی پھر واجب ہو گئی اس میں تناقض (تضاد) ہے جو اپنی نفی خود کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ "امر۔ واجب دراصل یہ ہے کہ امت میں کوئی شخص ایسا ہو جو فروعی احکام شریعت کا علم اس کے تفصیلی دلائل کے ساتھ رکھتا ہو۔ اس پر سب اہل حق متفق ہیں۔ اور جس بات پر کوئی امر واجب موقوف ہوتا ہے وہ بات بھی واجب ہوتی ہے اور جب ادائے واجب کے متعدد طریقے ہوں تو ان میں سے کسی ایک طریقہ کو اختیار کرنا واجب ہوگا اس کیلئے کسی خاص طریقہ کا تعین لازم نہیں۔ اگر اس کا ایک ہی طریقہ ہو تو خاص اس طریقہ کا حصول واجب ہوگا۔ جیسا کہ ایک شخص بھوک کی شدت میں مبتلا ہو اور اس کے باعث اسے ہلاکت کا ڈر ہو اور بھوک دور کرنے کے مختلف طریقے اس کے بس میں ہوں مثلاً کھانا خرید سکتا ہو، جنگل سے پھل توڑ سکتا ہو اور کھانے والے جانور کا شکار کر سکتا ہو تو اس کے لئے ان متعدد طریقوں میں سے بلا تعیّن کسی ایک کو اختیار کرنا واجب ہوگا لیکن اگر وہ شخص ایسے مقام پر ہو جہاں نہ شکار ہو نہ پھل توا سکے لئے ایک ہی طریقہ کہ مال خرچ کر کے کھانا خریدے واجب ہے۔

اسی طرح اسلاف کے پاس اس واجب اصلی (یعنی اجتہاد) کو حاصلکر نے کے چند طریقے تھے اور ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کو اختیار کرنا واجب تھا کسی خاص طریقہ کا تعین ضروری نہ تھا پھر جب سوائے ایک طریقے کے باقی طریقے ختم ہو گئے تو یہی مخصوص طریقہ واجب رہا۔

چنانچہ سلف میں حدیثیں نہیں لکھی جاتی تھیں لیکن آج احادیث کا لکھنا واجب ہے کیونکہ آج ان کتب احادیث کے سوا حدیثوں کی روایت کی اور کوئی صورت نہیں ہے اسی طرح اسلاف حصولِ علم نحو ولغت میں مشغول نہ ہوئے تھے کیونکہ عربی ان کی اپنی زبان تھی اور انہیں ان علوم میں سر کھپانے کی حاجت نہ تھی لیکن آج (ہمارے اس زمانے میں) عربی زبان کا علم باقاعدہ حاصل کرنا واجب ہو گیا کیونکہ سابقہ اہل عرب کا زمانہ بہت دُور چلا گیا۔ ہمارے اس قول کے شواہد بہت ہیں۔

اسی پر ایک معیّن امام کی تقلید کے واجب ہونے کو بھی قیاس کرنا چاہیے کہ ایک معین امام کی تقلید کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی واجب نہیں ہوتی مثلاً اگر ایک جاہل شخص ہندوستان یا ماوراء النہر کے کسی خطہ میں ہو اور اس کے قریب کوئی شافعیؒ، مالکیؒ یا حنبلیؒ عالم موجود نہ ہو اور نہ ان کے مسالک فقہ کی کوئی کتاب ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تقلید کرے اور اس سے باہر جانا اس کے لئے حرام ہو گا اس لئے کہ اس وقت اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اپنے آپ کو "دائرہ شریعت" سے نکال لے گا اور شترِ بے مہار بن کر رہ جائے گا بخلاف اس کے اگر وہ حرمین میں ہو تو چونکہ وہاں اسے تمام مذاہب فقہ کی معرفت میسر ہو گی اس لئے اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ وہ کسی غیر معتبر مسلک اور ظنی بات پر عمل کرے نہ وہ عوام کی زبان سے نکلی ہوئی سنّی سنائی پر عمل کرے اور نہ کسی غیر معروف کتاب سے کوئی قول اختیار کرے۔ یہ تمام باتیں کنز الدقائق کی شرح "نہر النائق" میں موجود ہیں۔

واضح ہو کہ مجتہد مطلق وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان پانچ علوم میں کامل ہو چنانچہ نوویؒ نے اپنی کتاب "المنہاج" میں کہا ہے۔ قاضی ہونے کی شرائط یہ ہیں: !۔ مسلمان ہو 2۔ مکلّف ہو 3۔ آزاد ہو 4۔ مرد ہو 5۔ عادل ہو 6۔ سننے، دیکھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور کافی رکھتا ہو (یعنی ایسا مرد جو فیصلہ کی صلاحیت تامہ رکھنے والا ہو) اور بالآخر یہ کہ اجتہاد کر سکتا ہو یعنی جو قرآن وحدیث کے ان حصوں کی جن کا تعلق احکام سے ہے، معرفت رکھتا ہو اور احکام خاص عام، مجمل ومبین، ناسخ ومنسوخ پر گہری نظر رکھتا ہو۔ حدیث کے متواتر وغیر متواتر اور احادیث متصل ومرسل کو سمجھتا ہو اور راویوں کے بارے میں جانتا ہو کہ کس کا قول قوی ہے اور کس کا ضعیف نیز زبان اور قواعد نحو سے واقف ہو۔ علمائے صحابہؓ اور ان کے بعد کے علماء کے اقوال میں باہم اتفاق واختلاف کو جانتا ہو اور قیاس کی اقسام سے واقف ہو۔

اس کے بعد معلوم ہو کہ مجتہد مطلق کی دو قسمیں ہیں: !۔ مجتہد مستقل 2۔ مجتہد منتسب۔ مستقل مجتہد تین خصلتوں میں دوسرے مجتہدین سے امتیاز رکھتا ہے جیسا کہ آپ یہ باتیں امام شافعیؒ میں نمایاں طور پر پاتے ہیں۔

مجتہد مستقل کے مخصوص خصائل کے منجملہ ایک یہ ہے کہ ان اصول وقواعد میں خود تصرّف (5) کر سکے جن سے فقہی مسائل مستنبط ہوتے ہیں جیسا کہ (امام شافعیؒ کی کتاب "الام" کے شروع میں مذکور ہے جہاں انہوں نے اپنے اسلاف کے طریقِ اجتہاد کا ذکر کرتے ہوئے بعض اصولوں میں ان کی اصلاح کی ہے جیسا کہ ہمارے بزرگ ابو طاہر محمد بن ابراہیم المدنیؒ نے اپنے بزرگان مکی سے نقل فرمایا ہے۔ ان میں شیخ حسن بن علی العجیمیؒ، شیخ احمد النخلی ہیں۔ بروایت شیخ محمد بن العلا الباہلی جنہوں نے شیخ ابراہیم بن ابراہیم اللقانیؒ اور عبدالرؤف الطبلاویؒ سے روایت کی اور انہوں نے ابوالفضل السیوطیؒ سے انہوں نے شیخ ابوالفضل مرجانیؒ سے یہ اجازت شیخ

ابوالفرج الغزیؒ سے انہوں نے یونس بن ابراہیم الدبوسیؒ سے انہوں نے شیخ ابوالحسن بن المقیر سے انہوں نے شیخ الفضل بن سہل الاسفرائنی سے انہوں نے الحافظ (6) الحجہ (7) ابوبکر احمد بن علی الخطیبؒ ۔ سے روایت کی ہے کہ ہمیں بیان کیا شیخ ابونعیم الحافظؒ نے ان سے بیان کیا شیخ ابومحمد عبداللہ بن محمد بن جعفر بن حدان نے ان سے بیان کیا شیخ عبداللہ بن محمد یعقوب نے ان سے بیان کیا۔ شیخ ابوحاتم یعنی الرازی نے ان سے بیان کیا شیخ یونس بن عبدالاعلیٰ نے، وہ کہتے ہیں کہ محمد بن ادریس الشافعیؒ نے کہا کہ "اصل سرچشمہ ہدایت قرآن وسنّت ہیں اگر ان میں نہ ہو تو ان ہی کو سامنے رکھ کر قیاس کیا جائے اور اگر کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتی ہو اور صحیح الاسناد ہو تو وہ سنّت ہے لیکن خبر واحد کے مقابلہ میں قیاس کو فوقیت حاصل ہے اور حدیث کے بارے میں یہ ہے کہ اس کا ظاہری مفہوم لیا جائے اگر کسی حدیث میں کئی معانی کا احتمال ہو تو جو معنی حدیث کے ظاہر سے قریب ہیں، وہ لئے جائیں اور اگر بہت سی احادیث باہم متعارض ہوں تو اولیت اس کو حاصل ہوگی جو سند کے لحاظ سے اول درجہ پر ہو اور منقطع حدیث کی کوئی حیثیت نہیں ماسوا سعید بن المسیّب کی منقطع احادیث کے۔

اور کسی شرعی اصل کو دوسری اصل پر قیاس نہیں کیا جائے گا نہ کسی اصل کے بارے میں " کیوں "اور " کس طرح" کا سوال اٹھایا جائے گا۔ البتہ فروعی مسائل میں " کیوں" کا سوال اٹھایا جاسکتا ہے۔ غرض اگر کسی فروعی مسئلہ کو بنیادی مسئلہ پر قیاس کرنا درست ہو تو وہ فرع صحیح اور قابل استدلال ہوگی۔ انتہی۔

مجتہد مستقل کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ احادیث وآثار کا ذخیرہ جمع کرے اس کے احکام کو سمیٹے اور ان میں سے فقہ کا ماخذ بننے والی احادیث سے باخبر ہو اور بعض احادیث کو بعض پر دلائل کے ساتھ ترجیح دے اور کسی ایک معنی کو متعین کر سکے

تب یہ چیزیں ہمارے نزدیک امام شافعیؒ کے دوتہائی علم کے برابر ہوسکتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

خصوصیات مجتہد میں سے تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان فروعی مسائل کا اپنے اجتہاد سے جواب دے سکے جو اس کے سامنے لائے جائیں اور جن کا اس سے قبل ان تینوں مبارک زمانوں میں جواب نہ دیا گیا ہو غرض ایسا ہی شخص (مجتہد مستقل) ان خصوصیات کے باعث مسائل شرعیہ میں بہت زیادہ تصرّفات کا حامل اور دوسرے ہمعصروں پر فائق ہوتا اور میدان فقہ کی بازی جیت جاتا ہے۔

ایک اور چوتھی خصلت جو ان تینوں کے ساتھ ہے وہ یہ کہ عالم بالا سے اس کے اجتہاد کے لئے مقبولیت کا نزول ہوتا ہے اور مفسرین، محدثین، اصولین اور فقہ کی کتابوں کے حافظ گروہ در گروہ اس علم کی طرف مائل ہو جاتے ہیں قرنہا قرن تک یہ اُسے قبول عام اور لوگوں کا رجحان رہتا ہے اور دلوں میں جم جاتا ہے (8)۔

اور مجتہد مطلق منتسب وہ ہے جو مقتدی ہو اور وہ پہلی خصوصیت میں کسی مجتہد کا پیرو ہو اور اس نے اسی کے مقرر کردہ اصولوں کو مان لیا ہو یہ دوسری خصوصیت کی قائم مقام خصلت ہے۔

اور مجتہد فی المذہب وہ ہوتا ہے جو پہلی اور دوسری خصلت میں امام مجتہد مستقل کو تسلیم کرے اور تفریعات (جزئیات مسائل) میں اپنے امام کا طرزِ عمل اختیار کرے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اس عہد متاخرین میں طبابت اختیار کرتا ہے۔ اب وہ یا تو اطبائے یونان کی اقتدا کرے گا یا اطبائے ہند کی یہ شخص بمنزلہ مجتہد مستقل کے ہے۔ اب اگر یہ طبیب اپنی عقل سے دواؤں کی تاثیر اور بیماریوں کی اقسام اور شربت یا معجونوں کے اجزائے ترکیبیہ سے باخبر ہو جائے کہ اسے اپنے اوپر بھروسا ہو جائے اور کسی طبیب کی پیروی کے بغیر اس بات پر قادر ہو کہ اطباء کی طرح کام کر سکے اور ایسی دواؤں کے خواص معلوم کر سکے جن کا تذکرہ ابھی تک نہیں ہوا اور

امراض کے ان اسباب وعلامات اور طریق علاج کا انکشاف کر سکے جن کی نشاندہی پہلوں نے نہ کی ہو بلکہ پیشروؤں کے نظریات سے ٹکر لے سکے خواہ یہ مخالفت محدود ہو یا وسیع ہو۔ ایسا شخص (طب میں) بمنزلہ مجتہد مطلق منتسب کے ہے۔

اور اگر ان تمام باتوں کو اطباء کے کہنے کے مطابق تسلیم کر لیتا ہے اور ذاتی طور پر کامل یقین نہ ہو اور اس کی بیشتر توجہ اس امر پر ہو کہ ان ہی اطباء کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق شربت اور معجون بناتے جیسا کہ اس زمانہ متاخرہ کے طبیبوں کا حال ہے۔ تو ایسا طبیب مجتہد فی المذہب کی طرح ہے۔

اسی طرح آج کل کے شعراء یا تو شعرائے عرب یا شعرائے عجم کی پیروی کرتے ہیں اور ان ہی کے اوزان، قوافی اور اسالیب قصیدہ کو اختیار کرتے ہیں۔ پس یہ شعرائے عرب وعجم بمنزلہ مجتہد مستقل کے ہیں پھر اگر یہ شاعر غزل، تشبیب، مدح، ہجو اور وعظ (پند) جیسی نئی نئی صورتیں ایجاد کرتا اور عجیب وغریب استعاروں اور نادر خوبیوں سے کام لیتا ہے جس کی کوئی نظیر نہ ہو بلکہ قدیم شعراء کی شعری خوبیوں کو دیکھ کر خود اس کا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا ہو کہ ایک نظیر سے دوسری نظیر اور ایک قاعدے سے دوسرا قاعدہ اخذ کیا ہو اور نئی بحریں نکالی ہوں یا کوئی نیا اسلوب ایجاد کیا ہو جو پہلے نہ تھا جیسے مثنوی، رباعی یا عربی اشعار میں ردیف کی قید یعنی کسی ایک لفظ یا زیادہ الفاظ کو ہر شعر کے اخیر میں قافیہ کے بعد لاتے رہنا (جو عربی میں رائج نہیں ہے) ایسا شاعر (عربی شاعری کا) مجتہد مطلق منتسب ہوگا۔

اور اگر کوئی شاعر نئی اختراع نہیں کر سکا صرف قدیم شعراء کے طریقوں کا تتبع کرتا ہے تو یہ بمنزلہ مجتہد فی المذہب کے ہوگا۔ یہی حال ہے علم تفسیر، علم تصوف اور دیگر علوم کا۔

اگر کہا جائے کہ اس کا کیا سبب ہے کہ اسلاف نے اصول فقہ پر زیادہ گفتگو

نہیں کی؟ البتہ امام شافعیؒ نے اس بارے میں کافی کام کیا اور بڑی اچھی اور مفید تحقیق کی۔

مؤلف کتاب کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ علمائے سلف میں سے ہر ایک کے پاس اپنے شہر ہی کی احادیث و آثار کا ذخیرہ تھا اور دیگر بلادِ اسلامیہ کی احادیث جمع نہ تھیں جب ان کے شہر کی احادیث کے دلائل بیں کوئی تعارض پیش آتا تو لوگ اس تعارض کا فیصلہ اپنی فراست کے مطابق کرتے تھے۔

امام شافعیؒ کے زمانہ میں تمام بلاد اسلامیہ کی احادیث اکٹھی جمع ہو گئیں تو ان مختلف شہروں کی حدیثوں میں اور ان کے فقہاء کے اختیار کردہ اقوال میں تعارض کی دو صورتیں تھیں۔ ایک تعارض تو دو مختلف شہروں کی احادیث میں تھا دوسرا تعارض ایک ہی شہر کی احادیث میں باہم ہوا کیونکہ ہر شخص اپنے استاد کی رائے کی جو اس نے اپنی فراست کے مطابق اختیار کی ہوتی، حمایت کرتا۔ انجام کار رخنہ وسیع تر ہو گیا اور بہت گروہ بن گئے اور ہر طرف سے بے شمار اختلافات کی یلغار ہوئی جس سے لوگوں کو حیرانی و پریشانی لاحق ہوئی اور نجات کی کوئی راہ نہ سوجھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوئی چنانچہ امام شافعی کو ایسے قواعد القا ہوئے انہوں نے تمام اختلافات جمع کئے اور اختلافات میں باہمی مطابقت کی سبیل نکل آئی۔

تیسری صدی ہجری کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں "مجتہدین مطلق منتسب" کا سلسلہ ختم ہو گیا اس لئے کہ کوئی شخص اس وقت تک مجتہد مطلق منتسب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ متبحر اور ناقدانہ بصیرت رکھنے والا عالم حدیث نہ ہو

علمائے احناف کا تعلق علمِ حدیث کے ساتھ پہلے بھی اور اب بھی کم رہا ہے اس لئے ان میں مجتہد فی المذہب ہی ہوئے اور اس شخص کا اشارہ اسی اجتہاد فی المذہب کی طرف تھا جس نے کہا کہ مجتہد بننے کے لئے کم از کم شرط مبسوط (للسرخسی)

کو یاد کرنا ہے۔

مسلکِ مالکیہ میں مجتہدین مطلق منتسب کم ہیں اور جو اصحاب اس مقام کو پہنچے ان کو مذہب مالکی میں جداگانہ حیثیت نہیں دی جاتی جیسے ابوعمر جو ابن عبدالبرؒ کے نام سے مشہور ہیں یا جیسے قاضی ابوبکر بن العربیؒ۔

امام احمدؒ کا مسلک نہ پہلے زیادہ پھیلا اور نہ اب اتنا زیادہ پھیلا البتہ ان میں نویں صدی ہجری تک عہد بہ عہد میں مجتہد ہوتے رہے یہاں تک کہ نویں صدی ہجری میں وہ ختم ہو گئے۔ بیشتر علاقوں میں یہ مسلک کمزور پڑ گیا تاہم حنبلی مسلک کا لگاؤ شافعی مذہب کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کے مسالک کا لگاؤ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے ساتھ۔ تاہم امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک کی تدوین مذہب شافعی کے ساتھ ملا کر نہیں ہوئی جیسا کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مسالک کی تدوین امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں شامل ہے۔ اسی لئے مسلک شافعیؒ و مسلک حنبلیؒ کو ایک مسلک شمار نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ ظاہر ہے، واللہ اعلم۔ مسلک حنبلی کی تدوین مسلک شافعی کے ساتھ ساتھ چنداں دشوار نہیں بشرطیکہ ان دونوں مسالک کو ان کی صحیح شکل میں دیکھا جائے۔

مسلک شافعی کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں اوروں سے زیادہ مجتہد مطلق منتسب اور مجتہد فی المذہب ہوئے ہیں جن میں اکثریت علمائے اصول و علمائے متکلمین کی ہے ان میں سے بیشتر مفسرین قرآن اور بکثرت شارحین حدیث ہیں جن کی روایات اور اسناد دوسروں کے مقابلہ میں بلحاظ اسناد و صحت روایات زیادہ قوی ہیں اور امام کے اقوال زیادہ صحت کے ساتھ منضبط ہیں۔ انہوں نے امام کے اقوال و اصحابِ وجوہ کے اقوال سے ممیّز کر کے بیان کیا ہے۔ مختلف اقوال و وجوہ میں ترجیحات پر زیادہ توجہ دی گئی اور یہ سب کچھ اس شخص پر مخفی نہیں، جس نے تمام مسالک کا مطالعہ

کیا ہواور ان کے ساتھ اس کا شغل ہو۔

امام شافعیؒ کے ابتدائی شاگرد مجتہد مطلق منتسب تھے، ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے امام شافعیؒ کے تمام مجتہدات میں ان کی تقلید کی ہو البتہ جب ابن سریج رحمتہ اللہ علیہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے تقلید و تخریج کے قواعد بنائے، ان کے بعد ان کے شاگرد آئے اور اسی راہ پر چلتے رہے اور اسی طریق پر گامزن رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں صدی کے شروع میں پیدا ہونے والے مجددین میں شمار کیا گیا ہے، واللہ اعلم۔

جس نے جملہ مسالک کا تحقیقی مطالعہ کیا ہو اس پر مخفی نہیں ہے کہ مسلک شافعیؒ کی بنیاد باقاعدہ فراہم شدہ احادیث و آثار پر ہے جن پر عمل ہوتا رہا۔ یہ شرف کسی دوسرے مسلک کو حاصل نہیں۔ منجملہ ان مدون کتب میں سے جن پر امام شافعیؒ کے مسلک کی بنیاد ہے، کتاب الموطا ہے جو اگرچہ امام شافعیؒ سے پہلے موجود تھی۔ امام شافعیؒ نے اسے اپنے مسلک کی بنیاد قرار دیا ہے اور کتابیں یہ ہیں: صحیح البخاری، صحیح مسلم اور کتب احادیث: ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی پھر مسند الشافعیؒ، سنن نسائی، سنن دار قطنی، سنن بیہقی اور امام بغویؒ کی شرح السنۃ۔

امام بخاری کو اگرچہ شافعی کہا جاتا ہے اور اکثر فقہی مسائل میں وہ امام شافعیؒ کے موافق ہیں پھر بھی بہت سے مسائل میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں اسی لئے امام بخاریؒ کی ذاتی رائے کو مسلکِ شافعی میں شمار نہیں کیا جاتا۔

ابوداؤد اور ترمذیؒ مجتہد منتسب ہیں جو امام احمد بن حنبلؒ اور امام اسحاقؒ کے پیرو خیال کئے جاتے ہیں۔

مؤلف کتاب کا کہنا ہے کہ ان کے خیال میں ابن ماجہؒ اور دارمیؒ کا بھی یہی حال ہے، واللہ اعلم۔

بہر حال مسلم اور ابوالعباس الاصم نے "مسند شافعی" اور کتاب "الام" کو جمع

کیا ہے۔ باقی وہ حضرات جن کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے یہ سب اپنا جداگانہ مسلک رکھتے ہیں اور مسلک شافعیؒ کے پابند نہیں ہیں، جن کے اپنے اصول ہیں۔

اگر ان تمام متذکرہ بالا باتوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ جس نے بھی مسلک شافعیؒ کی مخالفت کی وہ اجتہاد مطلق کے شرف سے بے بہرہ ہے۔ جو شخص امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کے فیض سے عاری ہو وہ علم حدیث کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔

و کن طفیلیهم علیٰ ادب فلا اری شافعاً سوی الادب

ان کا نیاز مند ادب کے لئے ہو جا ادب کے سوا میرا کوئی حامی نظر نہیں آتا

حواشی

1۔اصحاب الوجوہ۔ وہ علماء ہیں جو کسی امام مجتہد کے مقلد ہوں مگر جزوی مسائل میں اپنے امام کی رائے سے اختلاف بھی کرتے ہوں۔ یہ اختلافی آراء اسی امام کے مسلک کا جزو شمار کی جاتی ہیں۔

2۔جیسے امام شافعیؒ کے اقوال میں ہے کہ یہ ان کا پہلا قول ہے اور یہ دوسرا قول ہے۔

3۔وہ اس کی پرواہ نہ کرتے کہ ہم پہلے اس دوسری رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ جب ان کا اجتہاد ایک بات کو حق پاتا وہ بے تکلف اس کا اظہار کر دیتے تھے۔

4۔تفرد۔ کسی مسئلہ میں تمام فقہائے مسلک سے ہٹ کر کوئی مسلک اختیار کرنا۔

5۔مجتہدین نے استنباط کے جو اصول مقرر کئے ہیں ان کو بعینہٖ قبول نہ کرے بلکہ غور و فکر کے بعد اس میں ترمیم کر سکے۔

6۔حافظ، جسے ایک لاکھ احادیث مسند سنداً متناً و جرحاً و تعدیلاً و صحۃ و سقماً یاد ہوں۔

7۔حجتہ۔ ایسے ہی جسے تین لاکھ احادیث یاد ہوں۔

8۔شاہ ولی اللہؒ نے تین خصوصیات کے ساتھ یہ چوتھی کا ذکر جو کیا ہے مجتہد مطلق مستقل کے اجتہاد کا نتیجہ تو ہو سکتا ہے۔ مجتہد مستقل کی شرط نہیں ہے بخلاف پہلی تین خصوصیات کے۔

باب پنجم

چوتھی صدی ہجری کے بعد کے حالات

عہد مابعد میں جو لوگ آئے وہ مختلف راستوں پر چل پڑے۔ اور نئی نئی باتیں ایجاد کیں منجملہ ان کے علم فقہ میں لڑائی جھگڑا بھی ہے۔ اس کی تفصیل امام غزالیؒ نے اس طرح بیان کی ہے کہ "جب ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کا دور ختم ہوا تو خلافت ایسے لوگوں کے ہاتھ آ گئی جو بغیر استحقاق و استحکام کے اس کے مالک بنے انہیں علم فتویٰ اور احکام شریعت سے گہرا لگاؤ نہ تھا لہذا وہ مجبور ہوئے کہ فقہاء سے مدد لیں اور ہر وقت انہیں اپنے ساتھ رکھیں۔ اس وقت تک ایسے علماء موجود تھے جو سابقہ طرزِ شرائع پر ثابت قدم اور دین خالص پر قائم تھے چنانچہ انہیں خلفاء کی طرف سے طلب کیا جاتا تو وہ ان سے دور بھاگتے تھے۔

اس وقت کے لوگوں نے علماء کی یہ عزت اور ائمہ کا یہ اقبال دیکھا کہ باوجود حکام سے اعراض کے، وہ ان کی طرف لپکتے ہیں تو یہ دیکھ کر لوگ حصول عزت اور طلبِ جاہ کے لئے علم حاصل کرنے کی طرف مائل ہوئے چنانچہ جہاں فقہاء مطلوب (بے نیاز) تھے اب وہ خود طالب (نیاز مند) بن گئے۔ پہلے وہ ارباب اختیار سے بے توجہی برتنے کے سبب معزز تھے اب وہ حکام کی طرف خود متوجہ ہونے سے ذلیل ہونے لگے بجز ان کے جن کے شامل حال توفیق الہیٰ تھی۔

ان سے قبل کچھ لوگوں نے علم کلام میں کتابیں تصنیف کیں جن میں قیل و قال سے کام لیا اعتراض اور ان کے جواب درج کئے اور بحث کے قواعد جمع کئے۔ ان فقہاء کے لئے یہ چیزیں دلچسپی کا مرکز بن گئیں یہاں تک کہ بعض ایسے حکام آئے جو فقہی مناظروں سے دلچسپی رکھتے تھے کہ فلاں مسئلہ میں مسلک حنفی بہتر ہے یا مذہب

شافعیؒ۔اب لوگوں نے علم الکلام اور دوسرے علم چھوڑ دیئے اور امام شافعیؒ وامام ابوحنیفہؒ کے درمیان مختلف فیہ مسائل کی طرف خاص طور پر جھک پڑے۔ امام مالکؒ، امام سفیانؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر ائمہ کے مسالک کے بارے میں اس دلچسپی کا اظہار نہ کیا، ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ امورِ شریعت میں نکتہ رس ہو جائیں گے، اختلاف مسائل کا سبب جان لیں گے اور اصول فتویٰ کو ترتیب دے سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے متعدد تصانیف کیں، مسائل کا استنباط کیا، طرح طرح کے اختلافات پیدا کئے اور بہت سی تالیفات کیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور نہ معلوم کب تک اللہ کو جاری رکھنا منظور ہے۔ (تمام شد قول غزالیؒ)

واضح ہو کہ (بقول مؤلف) بہت سے لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اختلافات کی بنا وہ اصول ہیں جو امام بزدویؒ وغیرہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر اصول خود ان کے اقوال سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ (صاحب تالیف فرماتے ہیں کہ) میرے نزدیک یہ مسائل کہ "حکم خاص اپنے مدعا میں واضح ہے اس کے ساتھ کوئی تشریح وابستہ نہ کی جائے۔" اگر کسی حکم میں کچھ اضافہ کیا جائے تو وہ پہلے حکم کی تنسیخ ہے۔ عام بھی خاص کی طرح قطعی الدلالۃ ہے۔

کسی حدیث کے راوی زیادہ ہوں تو ضروری نہیں کہ اس کو ترجیح دی جائے۔ غیر فقیہ راوی کی روایت اگر قیاس کے خلاف ہو تو واجب العمل نہیں درآنحالیکہ (اس باب میں) رائے کا دروازہ بند ہو گیا ہو۔

مفہوم شرط اور مفہوم وصف (حالت) کا کوئی اعتبار نہیں (یعنی اس حکم پر عمل کے لئے اس شرط یا وصف کو بنائے حکم قرار نہ دیا جائے گا) اور جو حکم بصیغہ امر ہو اس پر عمل ضروری ہے۔

یہ اوراس کے مثل اوربھی اصول ہیں جوائمہ احناف کے کلام سے اخذ شدہ ہیں جن کی روایت امام ابوحنیفہؒ اورصاحبین سے صحیح نہیں ہے لہذا ان کا ذکر کرنا اور انکے استنباطات پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جواب کی زحمت اٹھانا متقدمین کا طریق کارنہیں ہے جیسا کہ امام بزدویؒ وغیرہ نے کیا لہذا بہ نسبت اس کے کہ اختلافات اوراس پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا جائے قابل اعتراض امور کا تتبع نہ کیا جائے ان کے منجملہ ان کا ایک اصول یہ ہے کہ امر خاص اپنے مفہوم میں واضح ہے پس اس کو کسی تشریحی بیان سے وابستہ نہ کیا جائے۔ یہ اصول انہوں نے متقدمین کے اس رویہ سے نکالا ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ارشاد "ارکعو واسجدوا"۔(1) (رکوع کرواور سجدہ کرو) اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول سے ہے، "آدمی کی نماز اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک وہ رکوع وسجود میں اپنی پیٹھ کوصحیح طرح نہیں بچھا دیتے"۔(2) چنانچہ انہوں نے رکوع وسجود میں اطمینان (ٹھہراؤ) کوفرض نہیں ٹھہرایا اور نہ حدیث کوآیت کی وضاحت مانا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کہ "وامسحوا برء وسکم"(3) اپنے سروں کا مسح کرو) کے بارے میں خودان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سر کا بمقدار ناصیہ مسح فرمایا اور متقدمین نے حضورؐ کے فعل کوآیت کی وضاحت جانتے ہوئے سر کے چوتھائی حصہ کا مسح فرض قرار دیا۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ "الزانیة والزانی فاجلد واکل واحد منہما مائة جلدة"(4) (زانیہ عورت اورزانی مردکوسو کوڑے مارو) اورآیت "والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما "(5) چور مرداورعورت کے دونوں ہاتھ پاؤ، کاٹو) اورآیت "حتی تنکح زوجاً غیرہ" (6) (یہاں تک کہ وہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے) وغیرہ آیات میں مخصوص المعنی الفاظ موجود ہیں ان احکام کی جوتشریح کی گئی ہے وہ بعد میں شامل حکم ہوگئی اس کے

جواب میں انہوں نے تکلف (باتیں بنانے) سے کام لیا جیسا کہ ان کی کتب میں مذکور ہے۔ اسی طرح انہوں نے یہ اصول بنایا کہ عام خاص کی طرح قطعی الدلالۃ ہے۔ یہ اصول انہوں نے پہلوں کے رویہ سے اخذ فرمایا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "فاقرء وا ما تیسر من القرآن "(7)(یعنی قرآن میں سے جو بسہولت پڑھ سکتے ہو، پڑھ لو)۔ ادھر آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد "لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب"(8)(فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوگی) چنانچہ انہوں نے قرآت قرآن کے عام حکم کو خاص نہیں بنایا۔ اسی طرح آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد "فیما سقت العیون العشر (9)(یعنی جن کھیتوں کو چشمے سیراب کریں ان پر عشر یا پیداوار کا دسواں حصہ عائد ہوگا)۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ "لیس فیما دون خمسۃ اوسق صدقۃ"(10)(پانچ وسق سے کم پیداوار میں (صدقہ) عشر نہیں ہے)۔ یہ اور ایسے ہی عام حکم میں جس میں کسی خصوصیت کا اضافہ نہیں فرمایا۔ پھر حنفیہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ "فما استیسر من الھدی "(11)(جو جانور میسر آجائے وہ قربانی دو) اور ایسا جانور بموجب تصریح آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بکری بھی ہوسکتا ہے اور اس سے بڑا جانور بھی اس اعتراض کے جواب میں تکلف (سخن سازی) سے کام لیا ہے۔

یہی حال ان کے اصول کا ہے کہ "لا عبرۃ بمفھوم الشرط والوصف" (کسی حکم شرع میں شرائط و وصف کا اعتبار نہ کیا جائے گا) لیکن اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں "و من لم یستطع منکم طولا"(12)(جو تم میں سے طاقت نکاح نہیں رکھتے) اپنے اس طرز عمل کو نظر انداز کر دیا یعنی اس شرط کا اعتبار کیا) نیز ان کے اس خودساختہ رویے پر بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں، مثلاً آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے " فی الابل السائمۃ

زکاۃ"(13)(چرنے والے اونٹوں پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے)(یعنی اس حکم میں صفت سائمہ کا اعتبار کیا جاتا ہے)۔انہوں نے اس کے جواب میں سخن سازی سے کام لیا اور یہ اصول بنایا کہ غیر فقیہ راوی کی روایت جو قیاس سے متصادم ہو واجب العمل نہ ہوگی اسی طرح حدیث مصراۃ (14) کے ترک کرنے میں اپنے اس اصول کو نظر انداز کر دیا پھر ان پر یہ اعتراض ہوا کہ حدیث قہقہہ (15)(یعنی نماز میں کھل کر ہنسنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) اور حدیث "عدم فساد الصوم بالاکل ناسیا"(یعنی بھول کر کھانے سے روزہ کا نہ ٹوٹنا) بھی تو قیاس سے متصادم ہے اس کے جواب میں بھی انہیں تکلف سے کام لینا پڑا۔

اس قسم کی مثالیں بہت سی ہیں جو کسی بھی صاحبِ تفتیش سے پوشیدہ نہیں اور جو تحقیق ہی کرنا نہ چاہے، اس کے لئے اشارہ درکنار طول کلام بھی ناکافی ہے۔اس سلسلہ میں اہل تحقیق کا یہ قول کافی ہے جو اس مسئلہ کے بارے میں ہے کہ" کسی ایسے راوی کی خلافِ قیاس روایت قبول نہیں کی جائے گی جو ضبط اور عدل میں تو شہرت رکھتا ہو مگر فقیہ نہ ہو درآنحالیکہ وہ روایت قیاس سے متصادم ہو جیسا کہ حدیث مصراۃ ہے۔یہ مذہب عیسیٰ بن ابانؒ کا ہے جسے متاخرین میں سے بہتوں نے اختیار کیا اور امام کرخیؒ اور ان کے بہت سے متبعین علماء، اس طرف گئے ہیں کہ خبر واحد کے مقبول ہونے کے لئے راوی کا فقیہ ہونا شرط نہیں، بوجہ اس کے کہ حدیث کو قیاس پر بہر حال فوقیت حاصل ہے۔ان کا کہنا ہے کہ یہ قول ہمارے ائمہ سے منقول نہیں ہے بلکہ ان سے تو یہ منقول ہے کہ خبر واحد بہر حال قیاس پر مقدم ہے۔کیا ہم نہیں دیکھتے کہ انہوں نے حدیث ابو ہریرۃؓ پر جو کہ روزہ دار کے بارے میں ہے کہ "بھول کر کھانے یا پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا" عمل کیا اگرچہ خلاف قیاس تھی حتیٰ کہ ابو حنیفہؒ نے کہا کہ "اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں قیاس پر عمل کرنا۔ مزید برآں ان کے باہمی اختلافات سے بھی یہ رہنمائی ہوتی

ہے جو ائمہ متقدمین کے اقوال کو سامنے رکھ کر متاخرین کے خودساختہ طریقِ کار میں ہیں اور جو ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔

مؤلف کتاب کا کہنا ہے کہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ جو ان طویل شرح مسائل اور ضخیم کتب فتاویٰ میں موجود ہے، وہ تمام امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کے اقوال ہیں۔ وہ ان میں فرق نہیں کرتے کہ فلاں بات ان کے اقوال سے اخذ کردہ ہے اور فلاں قول فی الواقع ان کا ہے۔ یہ الفاظ جو ان کی کتابوں میں اس طرح آئے ہیں کہ "علے تخریج الکرخی کذا" (امام کرخی کی تخریج کے مطابق یوں ہے اور علی تخریج الطحاوی کذا (امام طحاوی کی تخریج کے مطابق یوں ہے) یہ سب بے معنی ہیں۔ اسی طرح وہ اصحاب جو قال ابو حنیفہؒ کذا (امام ابوحنیفہؒ نے یوں کہا) اور جواب "المسئلة علی قول ابی حنیفة کذا" (یعنی امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق مسئلہ کا جواب یوں ہے) یا علی اصل ابی حنیفة کذا (امام ابوحنیفہؒ کے اصول کے مطابق مسئلہ یوں ہے)۔ کے درمیان امتیاز نہیں کرتے چنانچہ امام ابن الہمام اور امام ابن النجیم جیسے حنفی محققین حنیفہ کا ارشاد وہ نہیں سنتے جو (حوض کے بارہ میں) وہ دردہ کا مسئلہ ہے یا (جواز تیمّم) کے لئے پانی کے دور ہونے کا مفہوم ایک میل کا فاصلہ ہونے کی شرط ہے اور ایسے ہی دیگر مسائل سب ان اصحاب کی اپنی اخذ کردہ شرائط ہیں کوئی مسلک نہیں ہے۔

اسی طرح دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ اس گمان میں ہیں کہ حنفی مذہب کی بنیاد ان بحثوں پر ہے جو مبسوط للسرخی، الھدایة اور التبین وغیرہ میں مذکور ہیں۔ یہ نہیں خیال کیا گیا کہ اس طرح کے خیالات کا اظہار پہلے معتزلہ کی طرف سے ہوا ہے، ان کے مسلک کی اساس ان بحثوں پر نہیں ہے۔ بعدازاں متاخرین نے اس طریق کار کو

پسند کیا تا کہ دین میں وسعت اور فطانت پیدا ہو یا کوئی اور وجہ ہوئی۔

بہر حال اس کتاب سے بہت سے شکوک و شبہات جن کا ہم نے ذکر کیا، دور ہو جائیں گے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض اصحاب یہ گمان کرتے ہیں کہ اصحاب فقہ میں صرف دو گروہ ہیں تیسرا نہیں ہے یعنی اہل الظاہر اور اہل الرائے اور جو شخص بھی قیاس کرے اور استنباط (اخذ احکام) کرے وہ اہل الرائے ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ رائے سے مراد فقط فہم و فراست نہیں ہے بلکہ علماء میں سے کوئی بھی اس سے عاری نہیں اور نہ رائے وہ ہے جس کا تعلق سنّت سے بالکل ہی نہ ہو کیونکہ ایسی رائے تو کوئی بھی مسلمان ہرگز اختیار نہیں کرے گا اور نہ اخذ مسائل و قیاس اس طرح ممکن ہے لہذا امام احمدؒ، امام اسحاقؒ اور خود امام شافعیؒ بھی بالاتفاق اہل الرائے سے نہیں ہیں کیونکہ وہ مسائل مستنبط کرتے تھے اور قیاس بھی کرتے تھے بلکہ اہل الرائے سے مراد وہ لوگ ہیں جو جمہور مسلمانوں کے متفقہ مسائل کے بعد فروعی اور اختلافی مسائل کے اخذ کرنے میں کسی سابقہ امام کے اصول کو پیش نظر رکھنے پر اکتفا کریں۔ لہذا ان کے بیشتر مسائل کا انحصار سابقہ نظائر کی نظیر یا کسی سابقہ اصول پر منطبق ہو جائے نہ یہ کہ احادیث و روایات کی جستجو کریں۔

اور ظاہری (اہل الظاہر) وہ ہیں جو نہ قیاس سے کام لیتے ہیں اور نہ آثار صحابہؓ و تابعینؒ سے جیسے امام داؤد بن حزمؒ اور ان دونوں گروہوں کے درمیان محققین اہل سنّت کا گروہ ہے جیسے امام احمدؒ و امام اسحاق رحمۃ اللہ علیہ۔ اور ان ہی میں سے ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو تقلید پر مطمئن ہو گئے اور تقلید ان کے سینوں میں چیونٹی کی رفتار کی طرح غیر شعوری طور پر داخل ہو گئی اس کا سبب فقہاء کا باہمی اختلاف و نزاع ہے پس جب ان کے فیصلوں میں باہم اختلاف ہوتا تو صورت یہ ہوتی کہ جب بھی کوئی شخص کسی مسئلہ کی بابت فتویٰ دیتا تو اس کے فتویٰ پر اعتراض ہوتا اور اس کی تردید کی جاتی

اور جب تک کسی مسئلہ میں متقدمین کا قول بطور حجت نہ پیش کیا جاتا یہ بحث ختم نہ ہوتی۔

ایک اور سبب تفریق قاضیوں کا ظلم (حد سے تجاوز کرنا) ہے پس جب قاضی زیادتی کرنے لگے اور وہ اپنے کام میں امین نہ رہے تو ان کے وہی فیصلے قابل تسلیم ہوتے ہیں جن میں لوگوں کو شک وشبہ نہ ہوتا اور اس سے قبل اس طرح کا فیصلہ (یا اس کی نظیر) ہوتی۔

پھر یہ بھی ایک سبب ہے کہ سربراہ اشخاص بے خبر تھے اور عوام ان سے فتوے لیتے تھے جو نہ علم حدیث سے واسطہ رکھتے تھے اور نہ تخریج کے طریقوں سے، جیسا کہ اکثر متاخرین میں یہ نقص ظاہر ہے۔ امام ابن الہمامؒ وغیرہ نے اس صورت حال سے لوگوں کو آگاہ بھی کیا ہے۔

اس عہد میں اجتہاد سے نابلد کو بھی فقیہ کہا جانے لگا اور یہی وہ زمانہ ہے جب وہ تعصب میں پختہ ہو گئے اور حقیقت یہ ہے کہ فقہاء کے درمیان بیشتر اختلافات خصوصیت کے ساتھ ان مسائل میں ہیں جن میں خود اقوال صحابہؓ میں مختلف اقوال موجود ہیں مثلاً تکبیرات تشریق، تکبیرات عیدین، نکاح محرم نیز ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ کے درمیان تشہد (کی تعداد کے) بارے میں اختلافات یا نماز میں بسم اللہ اور آمین کو با آواز بلند پڑھنے اور اقامت میں کلمات اذان کو ایک بار یا دو بار کہنے میں اختلاف وغیرہ۔

ان امور میں اختلاف صرف دو قوموں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے بارے میں ہے ان مسائل کی اصل مشروعیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے اختلاف صرف یہ ہے کہ دونوں میں سے بہتر کیا ہے۔ اس اختلاف کی نظیر ایسی ہے جیسے قرآت قرآن (ادائیگی الفاظ قرآن) میں اختلاف ہے۔

اکثر اصحاب اپنے اختلافات کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ اس بارے میں صحابہؓ میں اختلاف تھا جبکہ سب کے سب صحابہؓ ہدایت کی راہ پر ہیں یہی وجہ ہے کہ علمائے متقدمین مسائل (اجتہادیہ) میں تمام مفتیوں کے فتوؤں کو جائز سمجھتے اور قاضیوں کے فیصلے تسلیم کرتے آئے ہیں اور بعض اوقات اپنے مذہب کے خلاف بھی عمل کرتے رہے ہیں چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ ائمہ مذاہب کے قول کی صرف تصریح کرتے ہیں اور موجودہ اختلاف کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ ان اقوال میں سے فلاں قول زیادہ محتاط ہے اور فلاں قول قابل عمل ہے اور مجھے تو فلاں قول زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور کبھی یہ کہتے کہ اس بارے میں ہم تک تو صرف فلاں بات پہنچی ہے۔ اس طرح کی باتیں المبسوط، تالیفاتِ امام محمدؒ اور کلام امام شافعیؒ میں بے شمار ہیں۔

اس کے بعد جو لوگ آئے انہوں نے اپنے سے پہلے لوگوں کے کلام کا خلاصہ کیا۔ اختلافات ثابت کئے اور اپنے ائمہ سلف کے اختیار کردہ قول پر سختی سے قائم رہے کیونکہ ان کے اسلاف نے انہیں سختی سے یہی بتایا تھا کہ اپنے امامؒ کے مسلک پر قائم رہیں کسی صورت میں اس سے نہ ہٹیں اور یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر انسان وہی پسند کرتا ہے جو اس کے اصحاب اور اس کی قوم کو مرغوب ہیں حتیٰ کہ غذا اور لباس کے بارے میں بھی یہی صورت حال ہے یا پھر اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ کسی خیال کے حق میں جو دلائل ہیں ان کی عظمت سے مرعوب تھے یا پھر اس طرح کی کوئی اور وجہ ہوسکتی ہے جسے بعض لوگوں نے یہ گمان کرلیا کہ یہ ان کے تعصب کا نتیجہ ہے لیکن یہ بات ان کی شان سے بہت بعید ہے۔

بات یہ ہے کہ صحابہؓ، تابعینؒ اور ان کے بعد کے اصحاب ایسے بھی تھے جو نماز میں "بسم اللہ" پڑھتے تھے اور ان میں ایسے بھی تھے جو نہیں پڑھتے تھے کچھ بآواز بلند

پڑھتے اور کچھ بآواز بلند نہ پڑھتے تھے۔ بعض فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھتے اور بعض نماز فجر میں دعائے قنوت نہ پڑھتے۔ بعض پچھنے لگوانے، نکسیر پھوٹنے اور قے کے بعد تجدید وضو ضروری سمجھتے اور بعض اس سے تجدید وضو ضروری نہ سمجھتے۔ بعض اصحاب جنسی عضو کا ہاتھ لگانے اور خواہش نفسانی کے ساتھ عورت کو مس کرنے پر وضو ضروری سمجھتے اور بعض اس سے وضو ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بعض اونٹ کا گوشت کھالینے کے بعد تجدید وضو ضروری سمجھتے اور بعض تجدید وضو ضروری نہ سمجھتے تھے۔ اس کے باوصف وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے مثال کے طور پر امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھی اور امام شافعیؒ وغیرہ مدینہ کے اماموں کے پیچھے نماز پڑھتے تھے حالانکہ (اہل مدینہ) نماز میں "بسم اللہ" پڑھتے ہی نہ تھے نہ بآواز بلند نہ آہستہ۔

ہارون الرشید نے پچھنے لگانے کے بعد نماز کی امامت کی، امام ابو یوسفؒ نے اس کے پیچھے نماز پڑھی اور نماز کو بعد میں لوٹایا نہیں۔ امام مالکؒ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ پچھنے لگوانے کے بعد تجدید وضو ضروری نہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ تھی کہ نکسیر پھوٹنے اور پچھنے لگوانے کے بعد نیا وضو کرنا چاہیے ان سے پوچھا گیا اگر امام کے جسم سے خون نکلے اور وہ نیا وضو نہ کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے؟ امام احمد بن حنبلؒ نے جواب دیا" کیسے ممکن ہے کہ میں امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ کے پیچھے نماز نہ پڑھوں؟

بیان کیا جاتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ عیدین میں حضرت ابن عباسؓ کے مسلک کے مطابق تکبیریں کہا کرتے تھے۔ (حالانکہ دونوں کا مسلک اس کے برعکس تھا) وجہ یہ تھی کہ خلیفہ ہارون الرشید کو یہ بات پسند تھی کہ عیدین کی نماز میں ان کے دادا عبداللہ بن عباسؓ کی تکبیریں ہوا کریں۔

امام شافعیؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے مقبرہ کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو دعائے

قنوت کوادباً واحتراماً ترک کر دیا اور کہا کہ کبھی ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔

امام مالکؒ نے مؤطا کے بارے میں خلیفہ منصور اور ہارون الرشید کو جو جواب دیا تھا اس کا ذکر آ چکا ہے۔

امام ثانی رحمتہ اللہ علیہ یعنی ابو یوسفؒ کے متعلق البرازیہ میں ہے کہ انہوں نے جمعہ کے دن حمام میں غسل کیا اور لوگوں کو نماز پڑھائی نماز کے بعد جب لوگ منتشر ہو گئے تو آپ کو خبر دی گئی کہ حمام کے کنویں میں ایک مرا ہوا چوہا پڑا ہے تو امام ابو یوسفؒ نے کہا "تو ہم اپنے مدنی بھائیوں (یعنی مالکیوں) کے مسلک پر عمل کر لیتے ہیں جن کا مسلک یہ ہے کہ جب پانی دو قلہ کی مقدار ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا، انتہیٰ۔

اور اس سلسلہ میں ایک امر یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہر فن میں باریک بینی کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ بعض اصحاب نے یہ گمان کر لیا کہ علم اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کی معرفت بنیادی امر ہے پھر وہ اسے چھوڑ کر قدیم وجدید تاریخ کی طرف متوجہ ہو گئے کچھ لوگ نامعلوم اور غریب ونادار حتیٰ کہ موضوع احادیث کی چھان بین میں مصروف ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے اصول فقہ میں قیل وقال (بحث وتمحیص) کو آگے بڑھایا اور ہر ایک نے اپنے ہم خیالوں کے لئے جھگڑنے کا طریقہ بتایا اور دوسروں پر بڑھ چڑھ کر اعتراض کئے اور اپنے خلاف اعتراضات کا خوب خوب جواب دیا۔ مسائل کی تعریف متعین کی اور ان کی قسمیں بتائیں اس طرح کبھی طویل اور کبھی مختصر تالیفات کیں۔ بعض اصحاب نے مسائل کی ایسی بعید از قیاس مفروضہ صورتیں پیش کیں جو اس قابل نہ تھیں کہ کوئی عقل مند ان کی طرف توجہ دیتا پھر ائمہ تخریج اور ان سے کم درجہ کی ایسی عام عبارتوں اور اشارات کو پسند کیا جسے نہ کوئی عالم سننا پسند کرے گا

نہ جاہل۔

اس بحث واختلاف اور نکتہ چینی کا فتنہ بھی تقریباً ایسا ہی فتنہ تھا جیسا کہ پہلے لوگ حکومت کے لئے باہم متصادم ہوئے جس میں ہر شخص نے اپنے ساتھیوں کی حمایت کی اور جس طرح اس کے نتیجے میں جابر بادشاہ برسر اقتدار آ گئے اور ہولناک واقعات رونما ہوئے۔ اس طرح اس بحث و نزاع نے غیر متوقع جہالت، کھوٹ، شکوک اور اوہام کو جگہ دی۔

پھر ان کے بعد جو نسلیں آئیں، ان کی بنیاد محض تقلید ہوئی اس میں نہ حق کو باطل سے امتیاز رہا اور نہ لڑائی جھگڑے کو اخذ مسائل سے۔ اب فقیہ وہ کہلاتا ہے جو زیادہ باتونی ہو، جس نے فقہاء کے اقوال یاد کر لئے ہوں، قوی اور ضعیف کی تمیز نہ ہو اور وہ انہیں باچھیں کھول کھول کر فرفر سنا سکتا ہو اور محدث وہ ہے جو صحیح اور سقیم احادیث کو گنا سکتا ہو اور وہ اپنے جبڑوں کے زور سے قصوں کی طرح فرفر بیان کر سکے۔

مؤلف کتاب فرماتے ہیں کہ میں نہیں کہتا کہ سب ہی کا یہ حال ہے کیونکہ اللہ کے بندوں میں ایسے بھی ہیں جنہیں بدنام کرنے والا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ ایسے لوگ زمین پر حقانیت الٰہی کا ثبوت ہیں اگرچہ یہ کم ہیں۔

اس کے بعد کا عہد فتنہ اور تقلید میں زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اس عہد میں لوگوں کے سینوں سے بصیرت کی امانت نکلتی گئی حتیٰ کہ "وہ امور دینی میں ترک غور و خوض پر بالکل مطمئن ہو گئے اور گویا کہتے ہیں کہ انا وجدنا آباء نا علی امة و انا علی اثارھم مقتدون" (یعنی ہم نے اپنے بڑوں کو جس ایک طریقہ پر گامزن پایا ہے ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کرتے رہیں گے) اب اللہ ہی سے ہماری فریاد ہے وہی ہمارا پروردگار ہے اسی پر بھروسہ ہے اور اسی کا سہارا ہے۔

یہ آخری بات ہے جس کا ہم نے اس رسالہ میں ذکر کرنے کا ارادہ کیا تھا

اس رسالہ کا نام "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" ہے (یعنی امت میں اختلاف کے اسباب کا بیان اور اس کی مناسب توجیہ)

(تمت بالخیر والعافیة)

حواشی

1۔سورۃ الحج:77۔
2۔سنن ابی داؤد: کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ من لایقیم حلبہ فی الرکوع وسجود۔
3۔سورۃ المائدہ:6
4۔سورۃ النور:2۔
5۔سورۃ المائدہ:38۔
6۔سورۃ البقرۃ:23۔
7۔سورۃ المزمل:20۔
8۔صحیح الترمذی: کتاب الصلوٰۃ یاباب الصلوٰۃ الابفاتحۃ الکتاب۔
9۔صحیح البخاری: کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقہ۔
10۔صحیح البخاری: کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقہ۔
11۔سورۃ البقرۃ:196۔
12۔سورۃ النساء:25۔
13۔سنن الدارمی، کتاب الزکوٰۃ، باب زکوٰۃ الاہل۔
14۔مصراۃ دودھ دینے والا جانور جس کا تھن تھیلی سے باندھ دیا گیا ہو (جس نے کوئی ایسا جانور بکری وغیرہ) خریدا جس کے تھن میں دودھ روک کر بیچا گیا ہو اسے تین دن تک اختیار ہے کہ بکری رکھ لے یا ایک صاع غلہ کے ساتھ واپس لوٹا دے۔
15۔جو آدمی نماز میں قہقہ لگائے اس کی نماز اور وضو دونوں ختم۔

اشاریہ

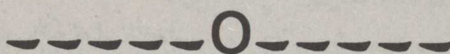
(الف) شخصیات

(ب) کتابیات

(ج) مقامات

(د) آیات

(ھ) احادیث



مرتبہ:

محمد نسیم عباسی

شخصیات

کتابیات

مقامات

فہرست آیات

فہرست احادیث